رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

نرخنامہ اجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھا صفحہ ۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بعہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں بیاسات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اسکے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

لکھنؤ نگار بک ایجنسی

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عار) علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۳ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان، قدرت بیان، علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول۔

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری، اور سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاءِ عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ر تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (عہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱)	فہرست مضامین مئی ۱۹۳۷ء	شمار (۵)

ملاحظات ——— ۲
ابو نواس ——— جلیل الرحمان اعظمی ——— ۹
بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں ——— ضیاء الدین احمد "برنی" ——— ۲۵
جوش کی ایک شاعرانہ لغزش ؟ ——— عندلیب شادانی ——— ۴۱
خدا کا انصاف ——— ۴۷
یوپی کا ایک نوجوان ہندو شاعر ——— ۶۲
مکتوبات نیاز ——— ۷۳
منظومات ——— اثر اکبر آبادی، عدم، تمکین، مضطر، نبی احمد بریلوی - ۷۵

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری | معاون:- جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	مئی سنہ ۳۷ء	شمار (۵)

ملاحظات

دستور جدید اور کانگرس

جس طرح انفرادی طور پر انسان کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جو اسکی دنیائے خیال میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی بعض ساعتیں ایسی آتی ہیں کہ قومی ذہنیت بدلدینے کی بڑی زبردست قوت ان کے اندر ودیعت ہوتی ہے۔ پھر اگر کوئی جماعت ان ساعتوں کی اہمیت کو سمجھ کر ان سے فایدہ اُٹھالیتی ہے تو وہ زندہ رہتی ہے، ورنہ زمانہ کا زبردست پہیہ گھومتا ہوا آتا ہے اور ہمیشہ کے لئے اسے پامال کرکے چلا جاتا ہے۔ یہ ہے قدرت کا وہ قانون جسکے تحت اسوقت تک ہزاروں قومیں بنیں بگڑیں اور آیندہ بھی بنتی بگڑتی رہیں گی۔

یکم اپریل سنہ ۳۷ء کو ہندوستان میں دستور جدید کا نفاذ ہوتا ہے اور سارے ملک میں ایک عام ہڑتال کے ذریعہ سے نہایت خاموش مگر زبردست احتجاج اس دستور کے خلاف کیا جاتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر

یوں سمجھئے کہ اہل ملک دستورِ جدید کو ایک لعنت قرار دیکر اس کے توڑ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دستورِ جدید ہندوستان کے لئے پیام رحمت بنکر آیا ہے اور وہی ساعتیں اپنے ساتھ لایا ہے جب قوموں کی پرانی تاریخ مٹتی ہے اور اس کی جگہ نئی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ساحل تک پہونچنے والی کشتیاں وہی تھیں جن کا رُخ ہوا کے تھپیڑے نے اِدھر سے اُدھر کر دیا تھا۔

دستورِ جدید نے جس وقت قانون کی صورت اختیار نہ کی تھی اور صرف مسودہ کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں زیر غور تھا، اسوقت بھی ملک کی ہر جماعت نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، لیکن آخرکار وہ قانون بنکر رہا، کیونکہ حکومت جانتی تھی کہ اس ملک کی مخالفت ہی کیا جہاں اختلافِ مذہب کے دیوتا پر "وطنیت" کی قربانی چڑھائی جا چکی ہو اور اب کہ اس دستور کا نفاذ ہندوستان میں ہو چکا ہے، وہ باوجود ہماری بیزاری کے ہم پر مسلط رہے گا کیونکہ حکومت کو یقین ہے کہ "نزاعِ کفر و دین" مٹنے والی چیز نہیں اور اس لئے جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ خدا کا حقیقی مسکن مندر ہے یا مسجد، (جو کبھی نہیں ہونا) حکومت سے اسکے "LION'S SHARE" چھیننے کا کس کو یارا ہو سکتا ہے۔

۱۹۱۹ء کے اصلاحات کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالات کی تحقیق کے لئے ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن آتا ہے جو کہ غیر ملکی افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ ملک اس کمیشن کا بائیکاٹ کرتا ہے اور اس کی شایع کردہ رپورٹ کو عام طور پر نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ زمانہ لارڈ ارون کی حکومت کا ہے جو یہاں کی سیاسی فضا کو دیکھ کر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستانی حکومت کا نصب العین ڈومنین اسٹیٹس (خود مختارانہ مقبوضاتی حیثیت) حاصل کرنا ہے، چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب ہندوستان جنگ آزادی میں مصروف تھا، اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے گول میز کانفرنس کا انعقاد طے پاتا ہے لیکن وطن پرستوں میں سے کسی ایک کو مدعو نہیں کیا جاتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ خود اس سے مطمئن نہیں ہوتی اور دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کو بھی نمایندۂ کانگریس کی حیثیت سے شریک کیا جاتا ہے، لیکن جب گاندھی جی ہندوستان واپس آتے ہیں تو یہاں کی فضا بہت مکدر نظر آتی ہے کیونکہ لارڈ ارون کے جانشین لارڈ ولنگڈن پوری عسکری قوت کے ساتھ کانگریس کی جنگ آزادی کو مٹانے میں مصروف نظر آتے ہیں اور لارڈ ارون اور گاندھی جی کے درمیان جو سمجھوتا ہوا تھا اس کو نظر انداز کرنے پر مُصر۔ آخرکار حکومت اور کانگریس کے درمیان پھر وہی حجابات حایل ہو جاتے ہیں اور اسی باہمی کشمکش و تنفر کے زمانہ میں تیسری گول میز کانفرنس کی

انعقاد ہوتا ہے اور ۱۹۳۳ء میں سفید کاغذ (WHITE PAPER) کے نام سے دستورِ جدید کا خاکہ بھی شائع ہو جاتا ہے جس کا عمل درآمد گزشتہ سال، مجلس مقننہ کے انتخاب سے شروع ہوتا ہے اور آخر کار یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے دستورِ جدید کا باقاعدہ نفاذ بھی ہو جاتا ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے موسوم ہے۔

دستورِ جدید کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ واضعین دستور نے اپنی تمام قابلیت اس بات میں صرف کر دی ہے کہ حریت پسند یا بالفاظ دیگر کانگریس جماعت کے اقتدار و اثر سے اسے بہت بلند (فروتر؟) رکھا جائے۔ اسی لئے انھوں نے اول تو شرائط رائے دہندگی کو اتنا سخت بنایا کہ ۲۵ فی صدی سے زیادہ رائے اہل ملک کی حاصل نہ ہو سکیں دوسرے ہر ہر جماعت کے لئے انتخاب (جداگانہ) کی شرط لگا کر، کانگریس کی کامیابی کو زیادہ ناممکن بنا دیا۔ الغرض جہاں تک محض دستور سازی کا تعلق تھا حکومت نے ہر ممکن خلا کو پُر کر لیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ملک کے صحیح جذبات کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر رہی۔

لارڈ ولنگڈن کی سخت گیر حکومت نے ملک کی شورش کو دبا کر برطانوی پارلیمنٹ کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی ہمیشہ کے لئے ختم کر دی گئی یا ختم کر دی جا سکتی ہے اور اسی پر اعتماد کر کے دستورِ جدید کا چیلنج ملک کو دیدیا گیا، در انحالیکہ حقیقت یہ نہ تھی اور اس حقیقت کا راز اسوقت کُھلا جب گزشتہ انتخاب میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کر کے حکومت کو دکھا دیا کہ حکومت اور دوسری مخالف قوتوں کی مخالفت کے باوجود ستر فی صدی سے زیادہ رائیں اہل ملک کی اسی نے حاصل کیں۔ انتخاب کے اس نتیجہ نے سب کی آنکھیں کھولدیں اور نہ صرف غیر کانگریسی جماعتیں بلکہ حکومت نے بھی اچھی طرح محسوس کر لیا کہ لارڈ ولنگڈن جس چیز کو اپنے پندار میں "جسد بیجان" بنا کر چلدئے تھے، اس میں نہ صرف یہ کہ آثارِ حیات باقی ہیں بلکہ قوتِ مسابقت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے — پھر میرے نزدیک یہی وہ ساعت ہے جو ہندوستان کا مستقبل اپنے اندر لئے ہوئے ہے لیکن افسوس ہے کہ اس سے فایدہ اُٹھانے کی جو تدابیر اختیار کرنا چاہئے تھیں ان کو ہم اپنے جوشِ کامیابی میں نظر انداز کر رہے ہیں — یہ بالکل درست ہے کہ کانگریس کا نصب العین دستورِ جدید کو توڑنا اور اس کی جگہ کسی ایسے دستور کا مطالبہ کرنا ہے جو صحیح معنے میں ہندوستان کو موجودہ دفتری اقتدار سے آزاد کرائے۔ سو اس مقصد کے حصول کی دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ دستورِ جدید کے نفاذ میں کوئی حصہ نہ لیا جاتا اور شروع سے انتخاب ہی کو ناقابلِ عمل بنا دیا جاتا، دوسری یہ کہ دستورِ جدید ہی کے قائم کردہ اُصول پر آئینی جنگ کیجاتی اور رفتہ رفتہ اپنے مطالبات حاصل کئے جاتے — کانگریس کی ایک جماعت (جو سوشلسٹ جماعت کے نام سے موسوم ہے) اول صورت کی حامی تھی لیکن چونکہ اکثریت اسکی نہ تھی اس لئے طے یہی پایا کہ کانگریس انتخاب میں حصہ لے اور اپنی اکثریت سے صوبوں کی حکومت پر اقتدار حاصل کرے، چنانچہ اس نے انتخاب

میں حصہ لیا اور ہندوستان کے چھ صوبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرکے حکومت اور حکومت پرستوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ کسی اور سوال کی گنجایش نہ تھی اور انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس کو عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہئے تھی، لیکن کانگرس کے ارباب حل و عقد میں پھر گفتگو شروع ہوئی کہ عہدے قبول کرنا چاہئے یا نہیں اور خدا خدا کرکے یہ بھی طے ہوا، لیکن مہاتما گاندھی نے جو ہمیشہ عین وقت پر کوئی نہ کوئی بدشگونی پیدا کر دینے کے عادی ہیں، یہ شرط لگا دی کہ پہلے گورنروں سے یہ اقرار لے لیا جائے کہ وہ کانگرس کی آئینی سرگرمیوں میں کوئی دخل نہ دیں گے اور اس کے بعد وزارتیں قبول کی جائیں — اگر اس سے گاندھی جی کا مقصود یہ ہوتا کہ اس طرح وہ وزارتیں قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں تو ہم اس کو ان کی شاطرانہ چال سمجھ کر خاموش ہو جاتے، لیکن لطف یہ ہے کہ وہ انتہائی سادگی سے یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ انھوں نے یہ شرط عاید کرکے گورنروں سے کوئی ایسا اقرار نہیں چاہا تھا جو دستورِ جدید کے اقتضاء کے خلاف ہوتا — بہر حال اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ یعنی چھ صوبوں کے گورنروں نے جہاں کانگرس کی اکثریت تھی ایسا اقرار نامہ داخل کرنے سے انکار کر دیا اور دوسری جماعتوں کی وزارتیں مرتب کرکے کام شروع کر دیا۔ اب کانگرسی جماعت اس کی منتظر ہے کہ اسمبلیوں کے جلسے طلب کئے جائیں اور وہ ان وزارتوں کو توڑ کر حکومت کی راہ میں مشکلات حایل کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان تدبیروں سے وہ دستور جدید کو ناقابل عمل ضرور بنا سکتے ہیں لیکن اس سے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اگر دستور جدید کو توڑنا ہی ان کا مقصود تھا تو اس کی صحیح تدبیر صرف یہ تھی کہ انتخاب میں بھی حصہ نہ لیا جاتا اور حکومت کے ضمیر میں یہ خلش پیدا کر دی جاتی کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے ملک کی اکثریت کے خلاف کر رہی ہے، لیکن جب کانگرس نے انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دیدی تو اس کے معنے صرف یہ تھے کہ اب وہ آئینی جنگ کرنا چاہتی ہے اور وزارتیں قبول کرکے جنگ کی یہی صورت اسے قایم رکھنا چاہئے تھی۔

یہ بالکل درست ہے کہ دستورِ جدید میں گورنروں کو اسقدر وسیع اختیارات دیدئے گئے ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف وزارتیں اور اسمبلیاں کچھ نہیں کر سکتیں، لیکن حصولِ اختیار اور استعمال اختیار میں بڑا فرق ہے اور اس لئے جب تک گورنروں کے طرز عمل سے یہ بات ثابت نہ ہو جاتی کہ وہ اپنے اختیارات کا بیجا استعمال کر رہے ہیں اسوقت تک کسی طرح مناسب نہ تھا کہ اس کا تاریک پہلو سامنے رکھ کر خواہ مخواہ گورنروں سے یہ کہا جاتا کہ "تم چھیڑ دو گے ضرور" — اس سے انکار ممکن نہیں کہ دستورِ جدید ہندوستان کی خواہش آزادی کو کسی طرح پورا کرنے والا نہیں اور یہ بھی بالکل درست ہے کہ صوبجاتی خود مختاری کی حیثیت ایک استبدادی حکومت سے زیادہ نہیں ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ اسکو آزادی ہندوستان کی طرف

پہلا قدم بتاتی ہے اور ہم کو اسکے اِسی بیان سے فایدہ اُٹھا کر دستور کی آمرانہ حیثیت کو توڑنا چاہئے۔ برطانوی قوم لاکھ
خود غرض سہی، لیکن اسی کے ساتھ اسکی آئین پسندانہ ذہنیت اتنی زبردست ہے کہ سخت اشتعال کی حالت میں
بھی وہ آئین کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہاں تک کہ اگر وہ کوئی ظلم کرنا چاہتی ہے تو پہلے اس ظلم کا ایک قانون
بنا دیتی ہے اس لئے اگر ہم تسلیم کر لیں کہ دستورِ جدید کیسر آئینی استبداد ہے تو بھی اس سے انکار ممکن نہ تھا کہ اسکے
اندر بعض اُصولی باتیں یقیناً ایسی پائی جاتی ہیں، کہ اگر گورنر جا و بیجا اپنے اختیارات ذاتی استعمال کرنے لگیں تو
برطانوی حکومت کی نیت کو ضرور مجبوب کر سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کانگرس آئینی جنگ کرنا چاہتی تھی تو اسکو
پس وپیش وزارتیں قبول کرکے اصطلاحات کا کام شروع کر دینا چاہیئے تھا اور دیکھنا چاہیئے تھا کہ گورنروں کا
طرزِ عمل استعمال اختیارات کے باب میں کیا ہے۔ اگر وہ ان کا بیجا استعمال کرتے تو بیشک وزارتوں سے دست بردا
ہو جانا چاہیئے تھا اور یہ صورت علحدگی کی زیادہ شاندار اور زیادہ مفید ہوتی۔ لیکن وزارتیں قبول کرنے اور کام شروع
کرنے سے قبل ہی یہ یقین کر لینا کہ گورنر ضرور ان کے کام میں حارج ہوں گے، اور کام کو ہاتھ نہ لگانا نہ صرف یہ کہ مصلحت
و تدبیر کے منافی ہے بلکہ اس میں ایسا چھچھورا پن پایا جاتا ہے جو کانگریس کی سنجیدگی کو صدمہ پہونچانے والا ہے۔

یہ بحث کرنا کہ گورنر از روئے دستورِ جدید کوئی وعدہ کر سکتے تھے یا نہیں، سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی
کہ قانونی موشگافیاں کرکے فضول وقت ضایع کیا جائے کیونکہ اگر گاندھی جی یہ شرط عاید کرنے کے بعد بھی یہی سمجھتے تھے
کہ گورنروں کے اختیاراتِ خصوصی بدستور اپنی جگہ باقی رہتے ہیں تو پھر اس وعدہ کا لینا نہ لینا دونوں بیکار تھا اور اگر
یہ سمجھتے تھے کہ گورنر ایسا وعدہ کرنے کے بعد اپنے اختیاراتِ خصوصی سے محروم ہو جائے گا تو یہ ان کی نادانی تھی۔

بہرحال اسوقت کانگرس کا یہ طرزِ عمل کسی طرح قرینِ عقل نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً اس نے وزارتیں قبول
کرکے ملک کے اغراض و مقاصد کو کافی نقصان پہونچایا ہے۔ کانگرسی جماعتوں کے بجائے اسوقت جتنی غیر کانگرسی
جماعتیں وزارت کی خدمات انجام دے رہی ہیں وہ بھی حتی الامکان ہندوستان کی اقتصادی پستی دور کر
عملی تدابیر اختیار کر رہی ہیں اور اسوقت تک کسی گورنر نے ان کی راہ میں کوئی دشواری حایل نہیں کی اس سے
کہا جا سکتا ہے کہ اگر کانگرسی وزرا بھی عہدے قبول کرکے واقعی اصطلاحات کی طرف متوجہ ہوتے تو ان کو پور
آزادی دیجاتی۔ البتہ اگر ان کا مقصود صرف دستور کو توڑنا ہو اور وہ بجائے تعمیری کام ول کے صرف تخریبی صورت
اختیار کرنے کے لئے آنا چاہیں تو بیشک گورنر ان کو اس کی اجازت نہ دے گا اور نہ اس تدبیر سے ملک کو کوئی فو
فایدہ پہونچ سکتا ہے — بہرحال اسوقت صورتِ حالات امید افزا نہیں ہے اور اگر اہل کانگرس کی یہی
ذہنیت قایم رہی تو بظاہر قیام فیڈریشن کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ گاندھی جی کے بیانات سے معلوم ہوتا
کہ انھیں اپنی اس غلطی کا احساس ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ بات کی پچ بھی ہے اور اس وقت تک

اس گتھی کو جو خود انھیں کی ڈالی ہوئی ہے سلجھا نہیں سکے۔ یہ حال تو ہوا ہندؤں یا ان لوگوں کا جو کانگریسی کہلاتے ہیں اب رہ گئی دوسری جماعتیں جن میں مسلمانوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، سو ان کا یہ حال ہے کہ وہ کانگرس کی کامیابی سے چونکی تو ضرور ہیں لیکن ابھی تک آنکھیں ملنے سے انھیں فرصت نصیب نہیں ہوئی۔

اس سے قبل بھی ہم لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو کانگریس میں شریک ہو کر کام کرنا چاہئے اور تمام وہ مسائل جن میں وہ حکومت کی مدد چاہتے ہیں کانگرس کے پلیٹ فارم پر طے ہونا چاہئے۔ کانگرس کسی مخصوص جماعت کی انجمن نہیں ہے بلکہ وہ سارے ہندوستان کی سیاسی مجلس ہے۔ میں نے بعض مسلمانوں کو کہتے سنا ہے کہ کانگرس پر ہندو جماعت قابض ہے اور اسلئے انکے مطالبات پر غور کئے جانے کی وہاں کوئی صورت نہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ ان کو کس نے منع کیا تھا کہ وہ یلغار کر کے کانگرس پر قابض نہ ہو جائیں، اور اب بھی اگر وہ اس پر آمادہ ہو جائیں تو کون انھیں روک سکتا ہے۔ جمیعتہ العلماء ہو یا مجلس احرار، مسلم لیگ ہو یا کوئی اور جماعت، اسوقت ان سب کا وجود بے معنی ہے اور مسلمان اگر کوئی سیاسی اہمیت حاصل کر سکتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ پوری اجتماعی قوت کے ساتھ وہ کانگریس میں حصہ لیں۔

نوادر ندوۃ العلماء

مسلمانوں کے کلچر کی وہ خصوصیت جو کسی حال میں بھی ان سے منفک نہیں ہوئی، اعتماد ذات اور خودداری نفس تھی اور علماء سلف کے تذکروں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، لیکن اب ہمارے علماء کرام اور ان کے قایم کئے ہوئے اداروں کی عزت نفس کا جو عالم ہے اس کا اندازہ ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے اس سپاسنامہ سے ہو سکتا ہے جو نواب صاحب رام پور کی خدمت میں ذریعۂ بقار حقیقت پیش کیا گیا ہے۔ اس کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں:-

"تمام ارکان ندوۃ العلماء ہز ہائینس حضور نواب صاحب بہادر کے دل سے شکرگزار ہیں اور بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور نواب صاحب ممدوح کو صحت و عافیت کے ساتھ عرصۂ دراز تک زندہ و سلامت رکھے اور ریاست رامپور کو سرسبز اور ابدالآباد تک قایم رکھے اور ترقیات عطا فرمائے۔ — عبدالعلی۔ ناظم ندوۃ العلماء

ان الفاظ کو غور سے پڑھیئے اور قطع نظر اس سے کہ ادبی حیثیت سے وہ صد درجہ طفلانہ ہیں، یہ دیکھئے کہ ان سے کتنی گدایانہ ذہنیت ٹپک رہی ہے۔ نواب رامپور نے احسان فرمایا ہو یا اپنا فرض ادا کیا ہو اس سے بحث نہیں، رقم تین سو کی ہو یا تین لاکھ کی یہ بھی خارج از گفتگو ہے۔ لیکن غور طلب امر صرف یہ ہے کہ کیا رسم تشکر اس سے زیادہ سنجیدہ و متین الفاظ میں ادا نہ کی جا سکتی تھی، کیا ندوۃ العلماء اصول ادب و انشاء سے اسقدر بیگانہ ہو گیا ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اجتماعی نقطۂ نظر سے رابطۂ عطا و قبول کی صورت، انفرادی رابطۂ عطا و قبول سے بالکل مختلف ہوا کرتی ہے۔ پھر سب سے

زیادہ حیرت اس امر پر ہے کہ یہ الفاظ جناب سید عبد العلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) کے قلم سے نکلے ہیں جو پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے بخوبی واقف ہیں کہ بزرگوں کے یہاں تو بڑے سے بڑا احسان بھی "نذر" سے زیادہ حیثیت اختیار نہیں کرتا، چہ جائیکہ تین سو روپیہ کی حقیر رقم ——— بہرحال یہ الفاظ گداگروں کے لئے تو موزوں ہو سکتے تھے لیکن ندوۃ العلماء کے شایان شان کسی طرح نہ تھے، پھر اگر یہ مذہبی و علمی ادارہ روپیہ فراہم کرنے کے لئے اسقدر نیچے گرنے کو بھی جائز سمجھتا ہے تو فرض کیجئے اگر کل میں پانسو روپیہ کی رقم ندوۃ العلماء کے خزانہ میں داخل کرنے کا وعدہ کر لوں تو کیا وہ اس سے زیادہ لجاجت آمیز دعائیہ قصیدہ ایک وفد کے ذریعہ سے میرے حضور میں پیش کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک تفریح ہے۔

اس سے قبل بھی یہ بات میرے کانوں میں پڑ چکی تھی اور ایک ہفتہ ہوا پھر مجھے یہ اطلاع پہونچائی گئی کہ مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی نے اپنی طرف سے ایک وظیفہ ندوہ کے اس طالب علم کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو داڑھی بڑھانے میں دیگر طلبہ پر سبقت لیجائے۔ میں نے ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے استفسار کیا کہ کیا واقعی یہ خبر صحیح ہے، لیکن جیسا کہ اس سے قبل ہمیشہ میرے سوالوں کا جواب خاموشی سے دیا گیا ہے، اس مرتبہ بھی اسی سکوت سے کام لیا گیا اور مجھے یہ سمجھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ یہ اطلاع غلط نہیں ہے ——— مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس طالب علم کو یہ وظیفہ دیا جاتا ہے، ہر مہینے اس کی داڑھی کی پیمائش کی جاتی ہے اور غور کیا جاتا ہے کہ اس نے اضافۂ تقدس میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے۔ بہرحال اس سے اور کوئی فایدہ ہو یا نہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر کسی وقت "حسنِ نسائی" کے ساتھ ساتھ "درازی ریش" کے مقابلہ کا بھی موقعہ آیا تو عورتوں کے عریاں و نامقدس حسن کے سامنے، ندوہ کے طالب علم اپنی مقدس داڑھیوں کا "جوڑ پھڑکانے" میں غالباً ناکام نہ رہیں گے یہ ہے ہمارے علمی اداروں کی گری ہوئی ذہنیت اور یہ رہ گیا ہے مفہوم مذہب و تعلیم مذہب کا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان داڑھیاں نہ رکھیں، میں اسکو بھی برا نہیں سمجھتا کہ ندوہ کے طلبہ کو داڑھی منڈوانے سے باز رکھا جائے لیکن اس کی بہترین تدبیر صرف یہ ہے کہ طلبہ کی ذہنیت میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ وہ طمع یا خوف نہیں بلکہ واقعی شعار اسلامی کے جذبہ سے مجبور ہو کر خود اس حرکت سے باز رہیں۔ ورنہ اس سے کیا فایدہ کہ جب تک شروانی صاحب کے وظیفہ کی لالچ یا ناظم صاحب کے احتساب کا خوف باقی ہے اسوقت تک تو وہ داڑھی بڑھائیں گے لیکن جب تعطیلوں میں وہ دار العلوم کی حدود سے باہر نکلیں تو سب سے پہلے یہ بوجھ ہلکا کرنے کے لئے انھیں نائی کی جستجو پیدا ہو۔

کاغذ کا مسئلہ اسوقت کاغذ نہ صرف یہ کہ بہت گراں ہوتا جاتا ہے بلکہ بازار میں آسانی سے ملتا بھی نہیں۔ یہاں لکھنؤ میں خود کاغذ کی مل ہے لیکن اس کو گورنمنٹ ہی کی فرمایش پوری کرنے سے فرصت نہیں ملتی، پبلک کے مطالبات کا کیا ذکر ہے ———

لکڑی کا گودا جو کاغذ کی طیاری میں صرف کیا جاتا ہے اس وقت دوچند سے زیادہ گراں ہو گیا ہے اور غالباً کئی سال تک یہی حالت رہے گی۔ جس کا اثر رسایل و اخبارات پر بہت خراب پڑ رہا ہے اور پڑے گا۔

پبلک کے ذوق کو دیکھتے ہوئے اسکی جرأت تو کسی جریدہ کو نہیں ہو سکتی کہ وہ قیمت میں اضافہ کرے البتہ وہ یہی کر سکتا ہے کہ کاغذ ہلکے قسم کا استعمال کرے، چنانچہ اس ماہ نگار کی بعض کاپیاں بجائے ۲۴ پونڈ کاغذ کے ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر چھاپی گئی ہیں اور اگر روزافزوں گرانی کا یہی عالم رہا تو مجبوراً ہمیں بھی ناروے کے کاغذ پر اتر آنا پڑے گا جسے پنجاب کے بعض رسایل اب استعمال کرنے لگے ہیں ——— وہ لوگ جو صرف معنی و حقیقت کو دیکھتے ہیں ان سے تو نہیں لیکن جو صورت و سطح کے شایق ہیں اُن سے ضرور اپنی اس مجبوری کا اظہار کرنا ہے درانحالیکہ ظاہری حسن و نمایش کے لحاظ سے نگار کبھی کوئی خصوصیت حاصل نہیں کر سکا، اور نہ اسوجہ سے کوئی اُس کا مطالعہ کرتا ہے۔

ابونواس

اور

اُس کی شاعری

ابونواس[1] کو پبلک میں روشناس کرنے اور اُس کے کلام پر فنی اعتبار سے نظر ڈالنے کا بہترین طریقہ تو یہ تھا کہ اُس کے اصناف کلام کا ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا اور اُس کی وہ خصوصیات بیان کی جاتیں جن میں وہ متفرد ہے اور وہ خوبیاں نمایاں کرکے دکھائی جاتیں جو اُس کے کلام کی خصوصیات ہیں پھر وہ جس مرتبہ کا شاعر ہے اُسی مرتبہ کے شعراء کا کلام پیش کرکے اُس کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، تاکہ اس کے مرتبہ شاعری کا صحیح اندازہ ہوسکتا

مگر یہ طریقہ ایک مضمون نگار کے لئے جس قدر دشوار ہے اُس سے زیادہ عربی زبان کی کس مپرسی اور کساد بازاری کے موجودہ عہد میں پبلک کے لئے غیر دلچسپ بھی ہے، اس لئے میں نے اُس کے کلام سے صرف اُسی حصہ کو منتخب کیا ہے جس سے ہر شخص لطف اُٹھا سکتا ہے۔

ابونواس کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو مضامین کے اعتبار سے اُس کے کلام کا بڑا حصہ چار ابواب پر

---

[1] ابونواس کا نام "حسن بن ہانی" تھا، نواس عربی لفظ ہے جس کے معنے زلف کے ہیں، چونکہ ابونواس کے بڑی بڑی زلفیں تھیں اس لئے لوگ اُسے "ابونواس" یعنی زلفوں والا کہنے لگے، یہ کیفیت بعد میں اس قدر مشہور ہوئی کہ لوگ اُس کا اصلی نام بھول گئے۔

اُس کا باپ بصرہ کا رہنے والا تھا اُس نے ایک ایرانی عورت سے شادی کرلی تھی جس سے ابونواس پیدا ہوا، ولادت و وفات کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے مگر زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سنہ ۱۴۵ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۹۵ھ میں اُس نے انتقال کیا

تقسیم ہوسکتا ہے، قصائد[1]، غزلیات[2]، خمریات[3]، ہزلیات[4]، میں نے اپنے مضمون میں انھیں ابواب کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔

گو اس کے مجموعۂ کلام میں فخر وحماسہ، ادب وحکمت، مرثیہ اور ہجو وغیرہ پر بھی جستہ جستہ اشعار ملتے ہیں لیکن ان ابواب شاعری سے نہ ابونواس کو کچھ دلچسپی تھی اور نہ اُس میں وہ کوئی امتیازی شان رکھتا تھا، اس لئے میں نے اُس کے ذکر سے قصداً گریز کیا ہے۔

ابونواس کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ اُسکی شاعری رندانہ عیش وطرب کی شاعری ہے، اُس میں والہانہ شیفتگی و دیوانگی پائی جاتی ہے، اُس کی زبان شستہ اور طرز بیان شگفتہ ہے، اُس کے الفاظ شیریں اور سریلے ہیں، استعارات وکنایات پرکیف اور وجد آور ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، وہ اپنی معشوقہ کو مخاطب کرکے اپنی شدتِ محبت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے:-

احللتِ من قلبي هواکِ محلةً ماحلّها المشروب والماکول	تو نے اپنی محبت میرے دل میں ایسی جگہ پہونچادی ہے، جہاں کھانے پینے کی چیزوں میں سے کسی کی رسائی نہیں

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ محبت دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئی ہے، ابونواس کا یہ انداز بیان بالکل اچھوتا ہے

ملٹن، شاعری میں تین چیزیں ضروری سمجھتا ہے، سادگی، جوش اور حقیقت ابونواس کے کلام میں اگر بہ نظر غایر دیکھا جائے تو یہی چیزیں ملیں گی، اُس کے اشعار اُس کے جذبات واحساسات کی صحیح تصویر ہوتے ہیں وہ عیش ونشاط، شراب وکباب اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتا ہے اور اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات پیش کرتا ہے، جس میں کہیں شراب وکباب کا ذکر ہے، کہیں ہجر وفراق کے نالے، کہیں رندان قدح خوار کے لطیفے ہیں اور کہیں معشوق طرحدار کے چوچلے الغرض اُس کے اشعار اُس کے واردات قلبی کا صحیح عکس ہیں۔

ابونواس بہت آزاد خیال اور رند مشرب آدمی تھا، وہ مذہبی قید وبند سے قطعی آزاد تھا وہ جو کچھ کرتا تھا علانیہ کرتا تھا، اُس کا کوئی کام شرمندۂ ریاکاری نہ تھا، وہ رند خراباتی تھا، شرابی تھا اور بالکل علانیہ، ملاحظہ ہو کہتا ہے:-

الا فاسقني خمراً وقل لي هي الخمر ولا تسقني سراً اذا امكن الجهر	ہاں! مجھے شراب پلاؤ اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے جب کھلم کھلا یہ سب کچھ ممکن ہے تو پھر چھپانے کی ضرورت کیا

---

[1] یہ اور اُسکے بعد کے تمام آنے والے اشعار اور اُنکے متعلق علمار کے اقوال میں نے "دیوان ابی نواس" اور ایک مصری مصنف علامہ ابن منظور کی کتاب "تاریخ ابی نواس" سے نقل کئے ہیں، بار بار حوالہ دینا بے سود ہوگا، جسے دیکھنا ہو اصل دیوان اور تاریخ ابی نواس" کا مطالعہ کرے۔

وہ فطرۃً بڑا شوخ مزاج اور ظریف واقع ہوا تھا، اُس کو اپنی فحش گوئی میں بڑا لطف آتا تھا، اُسکے اس قسم کے اشعار گو اخلاق سے گرے ہوئے ہیں جسے کوئی متین اور سنجیدہ انسان پڑھنا بھی گوارا نہ کریگا لیکن اس میں شک نہیں کہ انھیں ہفوات و لغویات میں جواہر پاروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ بھی دفن ہے جسے مکروہ چیز سمجھ کر کوئی چھوتا تک نہیں۔

امرد پرستی عہد عباسیہ کے خصوصیات میں سے تھی، ابو نواس چونکہ خود بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا اس لئے ابتداء عمر سے شاہد بازی کے ساتھ ہی ساتھ خود ایاز بننے کا جو چسکا اُس کو پڑ گیا تھا وہ کبھی نہ چھوٹا ملاحظہ ہو وہ اپنا ایک واقعہ خود ہی بیان کرتا ہے:۔

۱۔ ولقد ابیت علی السریر منعمًا ما بین غانیۃٍ و بین غلام	میں نے رات ایک دوشیزہ اور ایک لڑکے کے درمیان بڑے آرام سے گزاری۔
۲۔ فانیکہا و ینیکنی و انیکہ التذ من خلفٍ و من قدام	میں اُس دوشیزہ سے حماقت کر رہا تھا اور وہ لڑکا مجھ سے، میں آگے اور پیچھے دونوں طرف سے لطف اُٹھا رہا تھا

ٹالسٹائی کے نظریہ کے مطابق آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص طبقہ کی ملکیت نہ ہو بلکہ اُسکا فیض عوام و خواص، جاہل و تعلیم یافتہ، چھوٹے بڑے سب کے حق میں یکساں ہو، ابو نواس کے کلام کا اگر آپ بنظر غائر مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یہی چیز اُس میں ملے گی۔ اگر وہ ایک طرف شاہی درباروں میں بادشاہ، وزراء اور اُن کے مصاحبین کے لئے وجد آور تھا تو دوسری طرف سوقیانہ نائو نوش کی گرما گرم مجلسوں میں پیرِ مغاں اور اُن کے یاران قدح خوار کے لئے بے انتہا نشہ آور، اگر وہ اپنے شاعرانہ اعجاز اور ادیبانہ کمال کی وجہ سے علماء و ادباء کی محفلوں میں مقبول تھا تو جہلاء اور رندوں کی عیش گاہوں میں بھی سرور و کیف پیدا کرنے کے لئے اس کا کلام کم دلچسپ نہ سمجھا جاتا تھا۔

اگرچہ زمانہ نے اپنی بساط کے موافق ابو نواس کی کافی قدر کی، اور بارہا دربار خلافت سے خلعت و انعامات بھی اُسے ملے، مگر جب اُس کی شاعری کے اعجاز کا اندازہ کیا جاتا ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام قدر دانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدر دانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لیکر یوسف کی خریداری مصر کے بازار میں آئی تھی۔

گو ابو نواس کی ساری زندگی کا بڑا کارنامہ صرف اُس کی شاعری ہے تاہم اُس کے صرف اسی ایک کام نے عربی شاعری کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے، شام و سحر کی ہزار ہا نیرنگیاں ظہور پذیر ہوں مگر اُس کے اشعار کی قدر و قیمت کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔

فنون شاعری میں کمال یہ عجیب بات ہے کہ ایران میں اُسوقت شاعر کے لئے مختلف علوم وفنون میں کامل ہونا ضروری تھا، چنانچہ وہاں کے تمام مشاہیر شعرا نامور علماء وفضلا تھے لیکن اس کے بالکل برعکس عرب میں وہی شعرا، فن شعر کے امام اور پیشوا خیال کئے جاتے تھے جو جاہل تھے اور ایک حرف لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، شاعری اُن کی خمیر میں داخل تھی، نہ اُن کو عروض وقوافی کی ضرورت تھی اور نہ وہ فن بلاغت ومعانی سیکھنے کے محتاج تھے، بلکہ معانی وبیان، عروض وقوافی کی جتنی کتابیں آج ہم کو نظر آرہی ہیں وہ سب اُنھیں کے کلام سے ماخوذ ہیں۔

ابونواس کی تعلیم گو معمولی طور پر ہوئی تھی مگر شاعری میں اُس کو اس قدر قدرت حاصل تھی کہ جس مضموں کو چاہتا تھا بڑی خوبی سے ادا کر دیتا تھا، فلسفہ اور علم کلام کے اہم مسایل جسے جید علما، بڑے بڑے دفتروں میں بھی حل نہیں کر پاتے تھے ابونواس اپنے چند شعروں میں حل کر دیتا تھا، ملاحظہ ہو "جزء لایتجزیٰ" کا معرکۃ الآرا مسئلہ کس خوبی سے وہ اپنے ان دو شعروں میں حل کرتا ہے، وہ اپنی محبوبہ سے بیوفائی اور بے مروتی کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

۱۔ ترکتِ منی قلیلاً من القلیل اقلّاً،	تونے اپنے دل میں میرے لئے بہت کم گنجائش رکھی۔
۲۔ یکاد لایتجزیٰ اقل فی اللفظ من "لا"	یہاں تک کہ "نہیں" سے بھی کم جس کا تجزیہ ممکن نہیں۔

دور عباسیہ کا مشہور امام نظام نے جب یہ شعر سنے تو پھڑک اُٹھا اور اُس نے ابونواس سے کہا خدا کی قسم تمہارے "اشعر الناس" ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے، جس مسئلہ میں ہم برسوں سر کھپاتے رہے اُسے تم نے جس خوبی سے ان دو شعروں میں حل کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

یہ مسئلہ اپنی جگہ پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ جب کوئی چیز حد سے زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہے تو تاثیر اُسکی گرم ہوتی ہے، دیکھئے ابونواس اس مسئلہ کو کتنے پاکیزہ طریقہ سے بیان کرتا ہے، کہتا ہے:۔

۱۔ قل لزھیر اذا احدا رشدا اقلل اداکثر فانت مہذارُ	زہیر سے کہدو کہ جب وہ کسی چیز کی تعریف کرے تو صحت کا خیال رکھے کمی کرو یا زیادتی دونوں صورتوں میں تمہارا اعتبار نہیں،
۲۔ سخنت من شدۃ البرودۃ حتیٰ تی صرت عندی کانک النار	تم شدت برودۃ کی وجہ سے اب گرم ہو گئے ہو گویا اب تم میرے لئے آگ کی طرح ہو
۳۔ لایعجب السامعون من صفتی کذلک الثلج باردٌ حارُّ	سامعین میری اس بات پر تعجب نہ کریں، اس لئے کہ برف باوجودیکہ ٹھنڈی ہوتی ہے لیکن تاثیر اُس کی گرم ہے

ایک اور جگہ علم کلام کے اُس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے، جس کا فیصلہ بدقسمتی سے ابتک نہیں ہوا یعنی

"صفت عین ذات ہے یا نہیں" وہ اپنی ایک پرجمال معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے جس کا نام یحییٰ بن نفاق سے "حُسن" تھا

۱۔ ان اسم حُسنٍ لوجہھا صفۃٌ ولا اریٰ ذا فی غیرہا اجتمعا	"حُسن" کا نام درحقیقت اُس کے چہرہ کی صفت ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اُسکے علاوہ کسی میں یہ بات نہیں پائی جاتی
۲۔ فہی اذا سُمّیت فقد وُصفت فیجمع الاسم معنیین معًا	یہ عجیب بات ہے کہ اُسکا نام جب "حُسن" رکھا گیا تو وہ اُسکے لئے صفت بھی بن گیا۔ اور اس طرح ایک ہی اسم میں دو معنی جمع ہو گئے

کلام میں فارسیت چونکہ ابونواس اپنی ماں کی طرف سے فارسی النسل تھا اس لئے شروع شروع اُس کے کلام میں عجمیت کا رنگ پایا جاتا تھا مثلاً وہ ایک جگہ شراب کی تعریف میں کہتا ہے:۔

۱۔ تدار علینا الکاس فی عسجدیۃ حبتہا بانواع التصاویر فارس	ہمارے سامنے سونے کے جام میں شراب پیش کی جا رہی تھی جس میں مختلف قسم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔
۲۔ قرارتہا کسریٰ وفی جنباتہا مہیً تدریہا بالقسی الفوارس	تہ میں کسریٰ کی تصویر تھی اور اُس کے پہلو میں بڑے بڑے شہسواروں کے فوٹو تھے جو تیر و کمان چلا رہے تھے۔

....

....

....

شعرگوئی کے اوقات جو لوگ شاعر ہیں وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ بعض مرتبہ شعر گوئی کی مشق کے باوجود طبیعت میں ایسا انقباض پیدا ہو جاتا ہے جس کے بعد ایک شعر کہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

ذوالرمہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جب تمہاری طبیعت کُند ہوتی ہے تو تم شعر کیونکر کہتے ہو، اس نے کہا میں اُسوقت تنہائی میں بیٹھ کر اپنی کسی محبوبہ کو یاد کرنے لگتا ہوں۔

اخطل، ایسے حالات میں کسی پرفضا مقام پر سیر و تفریح کے لئے چلا جاتا تھا، اور شراب پی کر طبیعت میں روانی پیدا کرتا تھا۔

ابونواس عموماً ایسے اوقات میں شعر کہا کرتا تھا جب وہ بہت خوش دل و سرشار ہوتا تھا پھر اُسوقت وہ اور بھی عمدہ شعر کہتا تھا جب کہ اسے کسی خاص صلہ کی توقع ہوتی تھی، اس کے علاوہ وہ جو کچھ کہتا تھا اسے

خود پسند نہیں ہوتا تھا۔

شاعری میں ابونواس کا مرتبہ جس طرح متقدمین شعراء عرب میں امراء القیس کا مرتبہ مسلم ہے، اُسی طرح مولدین میں ابونواس کے اعجاز کا کوئی منکر نہیں۔

علماء ادب نے زمانہ کے اعتبار سے عربی شاعری کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے، جاہلیین مخضرمیین اسلامیین، مؤلدین۔ جاہلیین سے مراد وہ شعراء ہیں جو ظہور اسلام سے قبل گزرے ہیں، اُن کا زمانہ تقریباً ڈیڑھ سو برس رہا ہے، اُن میں سے حسب ذیل مشہور گزرے ہیں:۔

امراء القیس، طرفہ بن عبد، زہیر بن ابی سلمیٰ، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن شداد، نابغہ ذبیانی، حارث بن حلزہ، عروۃ بن ورد، اعشیٰ اور مہلہل وغیرہ۔

وہ شعراء جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں عہد پائے تھے "مخضرمی" کہلاتے ہیں، اُن میں سے حسان بن ثابت، نابغہ جعدی، کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ اور ابو ذویب وغیرہ مشہور ہوئے ہیں۔

جن شعراء نے جاہلیت کا زمانہ نہیں پایا بلکہ عہد اسلام میں نشو و نما پائی اُن کو "اسلامی" کہتے ہیں جنھیں سے فرزدق، جریر، اخطل، بشار بن برد، کثیر، جمیل، نعمان بن بشیر، کمیت بن زید اور مسکین دارمی وغیرہ نامور گزرے ہیں۔

پھر جو شعراء عہد عباسیہ میں پائے گئے وہ "مؤلدین" کہلاتے ہیں، اُن میں سے ابوالعتاہیہ ابونواس، ابن المعتز، ابن الرومی، ابوالعلاء المعری، ابو فراس، ابو تمام، بحتری اور متنبی وغیرہ مشہور گزرے ہیں۔

ابونواس اسی چوتھے دور یعنی مولدین میں سے تھا، یہ مسئلہ اب تک طے نہ ہو سکا کہ عرب کا سب سے بڑا شاعر کون تھا، دراصل یہ کوئی آسان بات بھی نہ تھی، اس لئے کہ ہر شخص کا مذاق مختلف ہوتا ہے تاہم عام طور پر علماء ادب، متقدمین میں امراء القیس اور متاخرین میں ابونواس کو تمام شعراء عرب پر ترجیح دیتے ہیں۔

ابو تمام جو عہد عباسیہ کا بڑا زبردست شاعر اور ادیب گزرا ہے کہا کرتا تھا کہ "ابونواس اور مسلم بن ولید میرے لات و عزیٰ ہیں جن کی میں صبح و شام پرستش کرتا ہوں۔"

ابوالعتاہیہ سے جو مؤلدین میں بہت بلند پایہ شاعر گزرا ہے کسی نے دریافت کیا کہ تمھارے نزدیک "اشعر العرب" کون ہے، اُس نے کہا سرزمین عرب کا سب سے بڑا شاعر جس کی مثال متقدمین اور متاخرین میں کہیں نہیں ملتی وہ ہے جس کے یہ اشعار ہیں۔

۱۔ اذا نحن اثنینا علیک بصالح فانت الذی نثنی و فوق الذی نثنی	جب ہم تیری تعریف کرتے ہیں تو تو ہی اسکا صحیح مستحق ہوتا ہے، اگرچہ تیری ہستی اُس سے بالاتر ہے

۲۔ وان جرت الالفاظ یوماً بمدحتہ
لغیرک انساناً فانت الذی نعنیٖ،

اگر کبھی کوئی لفظ کسی دوسرے کی تعریف میں ہماری زبان سے نکل جاتا ہے تو اُس وقت بھی حقیقتاً ہمارا مقصود تیری ہی ذات ہوا کرتی ہے۔

اُس شخص نے کہا یہ تو ابو نواس کے شعر ہیں ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔ ”ہاں! ہاں! ابو نواس ہی اشعر العرب ہے۔“

ابوالعتاہیہ کہا کرتا تھا کہ میں نے زہد پر سولہ ہزار شعر لکھے ہیں جن کا ایک ثلث میں ابو نواس کے حرف اس قصیدہ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں:۔

۱۔ الا رب وجہٍ فی التراب عتیق
ویارب حسنٍ فی التراب رقیق

ہاں! بہت سے چہرے ہیں جو مٹی میں مل کر فرسودہ ہو گئے
اور بہت سے حسن ہیں جو خاک میں مل کر ماند پڑ گئے

۲۔ فقل لقریب الدار انک راحلٌ
الیٰ منزلٍ نائی المحل سحیق

اپنے پڑوسی سے کہدو کہ اب تم بھی
ایسی منزل کی طرف کوچ کرنے والے ہو جو بہت دور دراز ہے۔

۳۔ وما الناس الا ہالکٌ وابن ہالک
وذونسبٍ فی الہالکین عریق

لوگ نہیں ہیں مگر نسلاً بعد نسلٍ ہلاک ہونے والے،
اور انھیں میں بڑے بڑے نسب والے بھی شامل ہیں۔

۴۔ اذا امتحن الدنیا لبیبٌ تکشفت
لہ عن عدوٍ فی ثیاب صدیق

جب کوئی عقلمند دنیا کا امتحان کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دشمن ہے جو دوست کے لباس میں ملبوس ہے

ابوالعتاہیہ یہ آخری شعر اکثر پڑھا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ کوئی خود دنیا سے اُس کی تعریف پوچھے تو شاید وہ بھی اس سے اچھی تعریف نہ کر سکے۔

خلیفہ ماموں نے ایک مرتبہ اپنے درباریوں میں سے جن میں بہت سے علماء وفضلاء تھے دریافت کیا ”بتایئے خلافت بنو ہاشم میں سب سے بڑا شاعر کون گزرا ہے، ایک نے کہا سب سے بڑا شاعر وہ تھا جس نے یہ شعر کہا ہے:۔

یا قبر معنٍ کنت اول حفرۃٍ
من الارض خطت للسماحۃ منزلا

اے معن کی قبر تو زمین کا پہلا گڑھا ہے
جو جود و کرم کی منزل بنا دیا گیا۔

دوسرے نے کہا جی نہیں سب سے بڑا شاعر وہ تھا جس کا یہ شعر ہے،

اشبہت اعدائی فصرت اُحبہم
اذ کان حظی منک حظی منہم

تو (اے محبوبہ) میرے دشمنوں سے مل جل گئی اسلئے میں اُنسے بھی محبت کرنے لگا جب میری قسمت تجھ سے وابستہ ہے تو اُنسے بھی ہے

مامون نے کہا آپ لوگوں کا اُس شخص کے متعلق کیا خیال ہے جس کا یہ شعر ہے :-

یا شقیق النفس من حکم	اے وہ جو حکما میری شریک حیات ہے
نمت عن لیلی ولم انم	تو آج میری رات میں سو جا، میں نہ سوؤں گا

سب چلا اُٹھے کہ بلاشبہ ابونواس اشعر العرب ہے۔

یہ بات عربی شاعری میں طغرا امتیاز رہی ہے کہ وہاں شاعری کی ابتدا شریفانہ جذبات سے ہوئی قصائد ایران کی طرح مداحی اور خوشامد میں عربوں کی زبان نہیں کھلی۔ عرب ہمیشہ سے جنگ جو، بہادر، مہمان نواز، سیر چشم، غیور اور بلند ہمت تھے، انھیں چیزوں کو وہ قصاید میں ادا کرتے تھے اور یہی انکی شاعری تھی۔

شاعری ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیر وزبر اور ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، وہ ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اُس کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے، شعراء عرب اکثر صاحب تیغ و علم ہوتے، وہ قصاید میں اپنے قومی معرکے لکھا کرتے تھے وہ اول تو کسی رئیس یا بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھتے نہیں تھے، اور اگر کوئی لکھتا بھی تھا تو واقعات سے ہرگز قدم آگے نہیں بڑھاتا تھا

سلامتہ بن جندل سے ایک رئیس نے کہا کہ میری تعریف میں قصیدہ لکھو، اُس نے فوراً جواب دیا "افعل حتی اقول" یعنی پہلے کچھ کر کے تو دکھاؤ۔

ابن میادہ نے بعض وجوہ کی بنا پر خلیفہ منصور کی مدح میں قصیدہ لکھا اور بغداد جانے کا ارادہ کیا تاکہ دربار میں جا کر سنائے، تھوڑی دیر کے بعد نوکر دودھ لیکر آیا اُس نے پیکر خدا کا شکر بھیجا اور کہا "جب تک مجھے یہ ملتا ہے مجھے منصور کی کیا ضرورت ہے"

شعراء عرب میں سب سے پہلا شخص جس نے کسی بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا، زہیر بن ابی سلمیٰ ہے، اُس نے پہلے پہل ہرم بن سنان کی شان میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا، زہیر کے بعد نابغہ ذبیانی نے سلاطین کی مداحی میں قصاید لکھنا شروع کئے، گو اس کی بدولت نابغہ اس قدر مالدار ہو گیا کہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا لیکن عرب میں اُس کی عزت جاتی رہی، نابغہ کے بعد اعشیٰ نے شاعری کو پیشہ بنا لیا، وہ جابجا مدح کرتا اور انعام لیتا پھرتا تھا، رفتہ رفتہ یہ مرض عام ہوتا گیا، دورِ عباسیہ میں عرب و عجم کے اختلاط نے اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا دیا حتیٰ کہ قصیدہ اور کاسۂ گدائی دو مترادف الفاظ ہو گئے

ابونواس کو شاعری کے اس باب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اسی وجہ سے اس خاص موضوع

میں اُس کے کلام کو کوئی نمایاں خصوصیت بھی حاصل نہ تھی تاہم اُس نے قصاید کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں جن میں علو مضامین کے ساتھ ساتھ شاندار الفاظ، اچھوتی تشبیہیں اور نادر استعارات استعمال کئے گئے ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتے مثال کے طور پر اُس کا وہ قصیدہ ملاحظہ کیجئے جو اُس نے پابہ زنجیر سرِ دربار اُسوقت خلیفۂ امین الرشید کے سامنے پڑھا تھا جب وہ غضبناک بیٹھا ہوا اپنی خون آشام تلوار تول رہا تھا اور موت ابونواس کے سر پر کھیل رہی تھی، ملاحظہ ہو، کہتا ہے :-

۱- تذکّر امین اللّٰہ والعھد یُذکر
مقامی و انشادیک والناس حُضّرُ

اے امین! ذرا میری حالت دیکھ اور اس بات کا خیال کر کہ میں تیرے اور سب کے سامنے کھڑا قصیدہ پڑھ رہا ہوں بیشک زمانہ ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے

۲- و نثری علیک الدر یادرہاشمٍ
فیامن رائی دراً علی الدر ینثرُ

اے بنو ہاشم کے موتی! میں تجھ پر موتی بکھیر رہا ہوں۔ ہاں کوئی ہے جو دیکھے کہ موتی موتی پر بہیر اجار رہا ہے۔

۳- ابوک الذی لم یملک الارض مثلہ
وعمک موسی الصفوۃ المتخیّرُ

تیرا باپ وہ تھا جسکے برابر آج تک کوئی زمین کا مالک نہیں ہوا اور تیرا چچا موسیٰ تھا جو برگزیدہ اور ستودہ صفات تھا۔

۴- وجدک مہدی الہدی وشقیقہ
ابوامک الادنی ابوالفضل جعفرُ

اور تیرا دادا مہدی تھا اور اُس کا بھائی ابوالفضل جعفر تیرا نانا تھا۔

۵- ایا خیر مامول یرجّیٰ انا امرؤٌ
اسیرٌ رھینٌ فی سجونک مقبرُ

اے وہ جسکی ذات سے بہترین امیدیں وابستہ ہیں، کیا میں ہی ایک ایسا گرفتار بلا ہوں جو تیری قید میں دفن ہو کر رہیگا۔

۶- مضت لی شہورٌ مذ حُبِستُ ثلاثۃٌ
کانّی قد اذنبتُ مالیس یغفرُ

مجھے گرفتار ہوئے تین ماہ گزر گئے، گویا میں نے ایسا گناہ کیا ہے جو بخشا نہیں جا سکتا۔

۷- فان کنت لم اذنب فضیم حبستنی
وان کنت ذا ذنبٍ فعفوک اکبرُ

اگر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے تو تو نے مجھے قید میں کیوں ڈال رکھا ہے اور اگر میں گنہگار ہوں تو تیرا عفو یقیناً اُس سے کہیں بڑا ہے۔

بات صرف یہ تھی کہ ایک مرتبہ ابونواس نے خلیفۂ امین کے چچا سلیمان بن ابی جعفر کی، نشہ کی حالت میں ہجو کہہ ڈالی جس سے امین سخت ناراض ہو گیا، پہلے تو اُس نے قید میں ڈال دیا، پھر بھی غصہ فرو نہ ہوا تو چاہا کہ سرِ دربار قتل کر ڈالے، اس لئے اُس نے ابونواس کو قید خانے سے بلوا بھیجا مگر اُس کا یہ فی البدیہہ قصیدہ سنکر ایوان شاہی تڑپ اُٹھا اور امین کا سارا غصہ کافور ہو گیا، اُس نے نہ صرف ابونواس کا قصور معاف کیا بلکہ شاہانہ انعام و اکرام سے اُسے مالامال کر دیا، شیریں بیانی اور حسن ادا کی مثالیں جو اس قصیدہ میں پائی جاتی ہے شعرائے عرب کے کلام میں کہیں نہیں ملتی۔

غزلیات عام طور پر شاعری تغزل کے مترادف سمجھی جاتی ہے، شاعر کو معشوق چاہیئے اور شراب ارغوانی، بس یہی دونوں چیزیں اُس کی دُنیا ہیں اور انھیں دونوں پر اُس کی زندگی ہے عشق و محبت انسان کا خمیر ہے، اس لئے کوئی ملک اور کوئی قوم شاعری کے اس صنف سے خالی نہیں علماء نفسیات کا خیال ہے کہ اگر عشق و محبت کا جذبہ لوگوں میں نہ پایا جاتا تو شاعری کا وجود بھی دنیا سے ناپید ہوتا، سینہ جب تک حضرت دل کا کاشانہ ہے اُسوقت تک محبت جنسیہ کی خواہشات کا اُس میں پایا جانا ایک فطری امر ہے، عشق کی سحر آفرینی اور اُس کی ہمہ گیری کا اظہار عرب کا ایک شاعر اس طرح کرتا ہے:۔

طاف الھوی فی بلاد اللہ کلھم	محبت تمام دنیا میں چکر لگا آئی،
حتی اذا مربی من بینھم وقفا	یہاں تک کہ جب میرے پاس پہونچی تو یہیں ٹھہر گئی۔

ایک دوسرے شاعر نے اس سے بھی زیادہ دلکش طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے، کہتا ہے:۔

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی	اس سے مجھے اُسوقت محبت ہوگئی جب میں نہیں جانتا تھا کہ
فصادف قلباً فارغاً فتمکنا	محبت کیا ہے؟ اُس نے میرا بھولا بھالا دل پاکر قبضہ کر لیا۔

ہمارے فارسی شعراء کا معشوق چونکہ ایک بازاری خوبصورت لڑکا ہوتا ہے اس لئے وہ کبھی تو اُس کی تلاش میں دیر حرم کا سفر کرتے ہیں اور کبھی آتش فراق سے بیتاب ہوکر دین و ایمان نذر بتخانہ کر بیٹھتے ہیں، اور بہ آواز بلند فرماتے ہیں۔ "کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست"

مگر شعراء عرب کا معشوق عفت و عصمت کا حرم نشیں ہے، وہاں تک رسائی مشکل ہے، اُدھر کا رخ کرنے سے پہلے تلواروں کا سامنا ہوگا، سیکڑوں سر کٹ جائیں گے، خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔ جاہلیت کے کسی شاعر کا شعر ہے:۔

دیار اللواتی دارھن عزیزۃ	محبوبہ، اُن گھروں میں چلی گئی جو بہت عزیز ہیں، اُن کی
بسمر القنا یحفظن لا بالتمائم،	حفاظت گندم گوں نیزوں سے کی جاتی ہے، تعویزوں سے نہیں

شعراء عرب کا دستور تھا کہ اگر اُن کی معشوقہ اُن سے بچھڑ کر کسی اور وادی یا صحرا میں چلی جاتی تھی تو وہ اُس زمانہ کو جب وہ دونوں ایک جگہ بیٹھکر باتیں کیا کرتے تھے، اُس جگہ کو جہاں دونوں ملتے، جلتے تھے، اور اُسکی محبت بھری باتوں کو یاد کرکے دل ہلا دینے والے اشعار کہا کرتے تھے، چنانچہ معلقات سبعہ نیز شعراء جاہلیت کے دیگر دواوین کل کے کل اُن کے عشق و محبت کی طویل داستانیں ہیں جس میں انھوں نے اپنی اپنی معشوقہ کا جذبات سے اس درجہ لبریز ذکر کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

یہ زمانہ جاہلیت کی داستان محبت کا حال تھا، یہی مذاق اسلام کے بعد والی دو صدیوں کے

شعراء کا بھی رہا، فرق صرف اتنا تھا کہ شعراء جاہلیت کی معشوقائیں اپنے اپنے عشاق کی دل سے چاہے جتنی قدر کریں مگر دلی جذبات کا اظہار عموماً بہت کم کرتی تھیں، اُس زمانہ میں بھی گو عورتیں بہت سی شاعرہ تھیں، مگر وہ شعر و شاعری سے صرف اُس وقت کام لیتی تھیں جب اُن کا شوہر، باپ، بھائی یا کوئی اور عزیز مرجاتا تھا، اُسوقت وہ اُن کی موت پر نوحہ خوانی کرتی تھیں، اُن کی شجاعت، سخاوت، ایثار نفس اور ہمدردی کے کارنامے بیان کرتیں اور اُن کے دشمنوں کی تحقیر کرتی تھیں۔

اسلام کے بعد یہ ہوگیا کہ عاشقانہ جذبات ظاہر کرنے والے تمام شاعروں کی معشوقائیں اُنکے عشق کی قدر کرتیں، اُن کے والہانہ جوش و خروش کا جواب اپنے سوز و گداز بھرے ہوئے شعروں سے دیتیں، چنانچہ اس عہد کے اکثر عاشق و معشوق مثلاً جمیل و بثینہ، کثیر و عزہ، قیس بن ذریح اور لبنیٰ، مجنوں عامری اور لیلیٰ، عروہ بن خرام اور عفراء نصیب و زینب، وغیرہ سب ہی شعر و شاعری میں کمال رکھتے تھے، جن کے دیوان دونوں کے کلام کا مجموعہ ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ عرب و عجم کے اختلاط سے دور عباسیہ میں شعراء عرب کا یہ مذاق بدل گیا، اب ایران کی طرح اُن کا معشوق بھی امرد اور حسین لڑکا ہوتا تھا جو اکثر بازاری ہوتا تھا، وہ ہر ایک کو ہاتھ آسکتا تھا، سیکڑوں سے تعلق رکھتا تھا، آج اگر وہ ایک سے ہمکنار ہے تو کل دوسرے سے ہم آغوش، کسی کی طرف دیکھکر مسکرا دیتا ہے، کسی سے اشارے کنائے کرتا ہے اور کسی کو فریب آمیز نگاہوں سے اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلاتا ہے۔

اس ایرانی مذاق کی داغ بیل گو پہلے سے پڑ چکی تھی لیکن ابونواس نے امین الرشید جیسے رند مشرب خلیفہ کے عہد میں اسے پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا، چونکہ اُس کی عادتیں بچپن سے بگڑی ہوئی تھیں، اس لئے بغداد پہونچتے ہی وہاں کی سدا بہار زمین اور پرکیف تمدن نے اُس کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کر دیا اور اُس نے شاعری کے اس باب کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

ابونواس کو غزلیات میں امرء القیس کا مدمقابل بتایا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جہاں تک دونوں کے بلند مرتبہ اور قادر الکلام شاعر ہونے کا تعلق ہے یہ بالکل صحیح ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ دونوں رند مشرب واقع ہوئے تھے مگر جہاں تک ان دونوں کے مذاق کا تعلق ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

امرء القیس حسن نسائی کا دلدادہ تھا اور ابونواس عشق غلمان پر فریفتہ، وہ کبھی عنیزہ سے محبت کی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے، کبھی ام حویرث اور ام رباب کی ہوس رانیوں کا تذکرہ کرتا ہے، کبھی دار جلجل کی

نہایت شہوت پرستانہ ساعت کو یاد کرتا ہے اور کبھی اپنی معشوقہ کے لئے اپنے اونٹ کی پرلطف قربانی کا حال بیان کرتا ہے۔

ابونواس کی ساری داستان عشق دیکھ ڈالئے، جنانؔ کے علاوہ آپ کو کوئی ایسی عورت نہ ملیگی جس سے اُس کو صحیح معنوں میں عشق ہوا ہو۔ اُس سے بھی وصال صرف اس لئے نہ ہوسکا کہ آپ اُس سے غیر فطری فعل کے طلبگار تھے، جسے جنانؔ کی غیرت نے کسی طرح گوارا نہ کیا۔

غزلیات میں جریرؔ کی شان بھی بہت نمایاں ہے لیکن زمانہ اور ملک کی آب و ہوا کا اثر ہر چیز پر پڑتا ہے، جریرؔ عہد اموبہ جیسے خشک اور روکھے دور کا شاعر تھا اور ابونواس عہد عباسیہ جیسے رنگین اور پرکیف زمانہ کی یادگار تھا، ظاہر ہے دونوں زمانوں میں جو فرق تھا وہی ان دونوں کے رنگ تغزل میں نمایاں ہے۔

معنی آفرینی اور حسن ادا میں ابونواسؔ کو جو کمال تھا اُس کی مثال شعرائے عرب میں کہیں نہیں ملتی، علماء عرب کا قول ہے کہ "معانی زمین میں مدفون تھے جسے ابونواس نے نکال کر بکھیر دیا" ملاحظہ ہو وہ ایک پری تمثال معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے جو ننگی بیٹھی نہا رہی تھی اور آپ کہیں آڑ میں کھڑے اُس کے حسن سے لطف اُٹھا رہے تھے، جب اُس کی نظر ان حضرت پر پڑی تو اُس نے جلدی سے اپنے بال اپنے جسم سیمیں پر جو ہوا سے زیادہ لطیف اور پانی سے زیادہ شفاف تھا پھیلا لئے اور اس طرح اُس نے اپنے جسم تاباں کو بالوں کی تاریکی میں چھپا لیا۔ وہ کہتا ہے:۔

۱۔ نضت عنہا القمیص لصب ماءٍ فورد وجہہا فرط الحیاء	محبوبہ نے نہانے کے لئے قمیص اُتاری اور فرط شرم نے اُسکے گلاب جیسے رخساروں کو سرخ کردیا
۲۔ وقابلت الہواء وقد تعرت بمعتدل ارق من الہواء	اُس نے کپڑے اُتار کر اپنے سڈول جسم سے جو ہوا سے زیادہ لطیف تھا گویا ہوا کا مقابلہ کیا۔
۳۔ ومدت راحۃ کالماء منہا الی ماءٍ معدٍ فی اناء	اُسنے اپنی ہتھیلی جو پانی سے زیادہ شفاف تھی، پانی لینے کے لئے بڑھائی جو برتن میں تیار رکھا تھا۔
۴۔ فلما ان قضت وطرا وہمت علی عجلٍ الی اخذ الرداء	جب وہ نہا چکی اور اُس نے جلدی سے چادر لینے کا ارادہ کیا۔
۵۔ رأت شخص الرقیب علی التدانی فاسبلت الظلام علی الضیاء	تو اُسنے اچانک ایک ایسے شخص کو دیکھا جو قریب ہی تاک میں کھڑا تھا اُسنے فوراً ہی تاریکی (یعنی بالوں کو) روشنی (یعنی جسم سیمیں) پر ڈالدیا

۶۔ وغاب الصبح منہا تحت لیل وظل الماء یقطر فوق ماء،	گویا صبح کی روشنی رات کی تاریکی میں چھپ گئی، اُسکے شفاف جسم سے پانی کے قطرات اس طرح گر رہے تھے جیسے پانی پانی پر گر رہا ہو
۷۔ فسبحان الالہ وقد راہا کاحسن مایکون من النساء	پاک ہے وہ خدا جس نے ایسی ایسی خوبصورت عورتیں پیدا کی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ خلیفہ ہارون رشید سے تعلق رکھتا ہے، ابونواس کو کچا چٹھا معلوم ضرور ہوگیا تھا جسے اُس نے ہارون رشید کی فرمائش پر نظم کرکے اُس کی خدمت میں پیش کیا تھا اور بہت کچھ انعام واکرام بھی حاصل کیا تھا، مگر علماء ادب اس سے انکار کرتے ہیں اس لئے کہ ابونواس ہارون رشید کے عہد کا نہیں بلکہ امین کے دور کا شاعر ہے۔

بہر کیف واقعہ کا تعلق کسی سے بھی ہو یہاں دیکھنا صرف یہ ہے کہ ابونواس معنی آفرینی اور حسن ادا میں کس مرتبہ کا شاعر تھا!!

یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعر اپنے گردوپیش کے حالات اور زمانہ و وقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اگر ابن المعتز شاہی خاندان سے نہ ہوتا تو یہ شعر کبھی نہ کہہ سکتا۔

فانظر الیہ کزورق من فضۃ، قد اثقلتہ، حمولۃ من عنبر	چاند کو دیکھو، گویا وہ ایک چاندی کی کشتی ہے، جو عنبر کے بار سے پانی میں دبی ہوئی ہے۔

ہلال دیکھ کر عنبر کے بار سے دبی ہوئی چاندی کی کشتی کی طرف خیال منتقل ہونا اُسی وقت ممکن ہے جب کسی نے ان چیزوں کو دیکھا بھی ہو۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ درحقیقت اُس کی زبان نہیں بلکہ وہ اُس زمانہ اور ملک کی زبان ہوتی ہے جس میں وہ اور اُسکے خیالات وجذبات پل کر جوان ہوتے ہیں، ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا، شکسپیر اور ملٹن کا بھی یہی حال تھا، زمانۂ جاہلیت کے شعراء کا فطرت پرست ہونا بھی اسی بناء پر تھا۔

ابونواس بھی اپنے وقت اور زمانہ کے حالات سے متاثر ہوا بلکہ اُس رنگ میں اس طرح رنگ گیا جس میں کوئی دوسرا شاعر اُس کا شریک نظر نہیں آتا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ غیر فطری چیز کبھی حقیقت کا رنگ اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتی، امرد پرستی اور شاہد بازی پر ابونواس نے خوب خوب طبع آزمائی کی ہے، مگر اُس میں وہ بات نہ پیدا کرسکا جو ایک فطری اور حقیقی عشق میں ہوتی ہے۔

حُسن اتفاق سے وہ ایک مرتبہ جنان نامی ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہوگیا، اور اس بری طرح سے کہ اُسے جنان کے علاوہ دین و دنیا کی کچھ خبر نہ رہی، اُس کے کلام کا یہ حصہ نہایت پاکیزہ، دلدوز

اور پُر اثر ہے، یہاں ہم اُسی میں سے کچھ انتخاب پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جنانؔ جیسی خوبصورت اور پریجمال تھی ویسی ہی پڑھی لکھی عاقل اور سمجھدار عورت تھی، ایک مرتبہ وہ ابونواس کے مکان کی طرف سے گزری جہاں وہ اور اُس کے ساتھی بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے جنانؔ کو دیکھتے ہی ابونواس دل پکڑ کر رہ گیا، اُس کے ساتھیوں نے کہا "یہ کیا؟ اب کیا تم لڑکوں کو چھوڑ کر عورتوں پر جان دینے لگے؟" - اُس نے کہا "ہاں! اب میں ایک ایسے چاند سے مکھڑے پر مرتا ہوں جس سے نظریں نہیں ملائی جاسکتیں، تم اگر غور سے اُسے دیکھو تو تمھیں تعجب ہوگا کہ وہ انسان ہے یا فرشتہ!!

پھر تو روز بروز اُس کا عشق بڑھتا گیا، حتیٰ کہ وہ اپنا سب کچھ اُس کے پیچھے کھو بیٹھا، اُس کی شان میں ہزار ہا شعر کہہ ڈالے بہتوں کی خوشامدیں کیں، کئی مرتبہ اُس کے پاس قاصد بھیجے، مگر جنانؔ نے کبھی گالی اور کوسنے سے کم بات ہی نہیں کی، ابونواس کے لئے یہ تمام گالیاں اور کوسنے "جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا" کا مصداق تھیں، اُس کی گالیوں کے جواب میں جو اُس نے شعر کہے ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ملاحظہ ہو، وہ کہتا ہے:-

۱- أتاني عنك سبك لي فسبي أليس جرى بفيك اسمي فحسبي	تجھ تک تمھاری گالیاں پہونچیں، بسم اللہ اور دو، کیا میرے لئے یہ کم فخر کی بات ہے کہ تمھاری زبان سے میرا نام تو ادا ہوا جو تمھارا جی چاہے کہو،
۲- وقولي ما بدا لك ان تقولي فما ذا كله الا لحبي	میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ صرف محبت کی وجہ سے ہے۔
۳- فصار له الرجوع الى وصالي فما تهوين من تعذيب قلبي	ان باتوں کا انجام وصال ہوگا، تم میرا دل دکھانا معمولی بات نہ سمجھو،
۴- تشابهت الظنون عليك عندي وعلم الغيب فيما عند ربي	تمھیں میری طرف سے بہت سی بدگمانیاں ہوگئی ہیں، حالانکہ غیب کی باتوں کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا ہے۔

جنانؔ کے اعزا میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا وہ دوسری عورتوں کے ساتھ وہاں کھڑی ماتم کر رہی تھی، ابونواس کو پتہ لگ گیا، یہ بھی فوراً پہونچا، مگر یہ منظر اُس سے دیکھا نہ گیا کہ جنانؔ اپنے دست نازک سے جس میں ہلکی ہلکی مہندی لگی ہوئی تھی برابر ماتم کئے جارہی ہے اس موقعہ پر جو اُس نے شعر کہے ہیں بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔ کہتا ہے:-

۱- يا قمراً ابرزه مأتم يندب شجواً بين اتراب	اے وہ چاند جو ایک ماتمی جلسہ میں طلوع ہوا ہے اور جو اپنی سہیلیوں کے درمیان مصروف ماتم ہے۔

۲- يبكي فيذري الدر من نرجس
ويلطم الورد بعناب،

اے وہ تو جو رو رہی ہے اور اپنی نرگسی آنکھوں سے موتی بہا رہی ہے، اور گلاب جیسے رخساروں پر اپنی مہندی لگی ہوئی انگلیوں سے طمانچہ مار رہی ہے۔

۳- لاتبک ميتا حل في حفرة
وابک قتيلا لک بالباب،

ایسے مردہ پر نہ رو جو گڑھے میں جا چکا ہے،
بلکہ اپنے اُس شہید محبت پر رو جو تیرے دروازہ پر پڑا ہے

ابونواس نے ایک مرتبہ سنا کہ جنان حج کے لئے جانے والی ہے، فوراً خود بھی روانہ ہو گیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی، اُسے سخت افسوس ہوا، اُس کو خیال تھا کہ شاید اس طرح زیارت ہو جائے دیکھئے وہ کہتا ہے:-

۱- الم تر انني افنيت عمري
بمطلبها ومطلبها عسير

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں نے اپنی ساری عمر اُس کے حاصل کرنے کے لئے گنوا دی، مگر اُس کا ملنا بہت مشکل ہے

۲- فلما لم اجد سببا اليها
يقربني واعيتني امور

جب مجھے کوئی بھی ذریعہ ایسا نہ ملا جس سے میں اسکے قریب پہونچتا اور حالات نے بار بار مجھے مایوس کیا۔

۳- حججت وقلت قد حجت جنان
فيجمعني واياها المسير

تو میں نے حج کیا اور دل میں خیال کیا کہ شاید جنان بھی کرے اور اس طرح ہم اور وہ دونوں یکجا ہو سکیں۔

اِدھر ابونواس کی جس قدر وارفتگی بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر اُدھر جنان کو اُس سے نفرت زیادہ ہوتی جاتی تھی، اپنی بدنامی کے خیال سے وہ اس کو بری طرح گالیاں دیا کرتی تھی، ایک مرتبہ جنان نے لوگوں سے کہا۔ "خدا اس جھوٹے مخنث کو سمجھے جو خواہ مخواہ مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے" یہ بات بھی ابونواس کے دل کو بھا گئی۔ دیکھئے کہتا ہے اور بہت خوب۔

۱- جنان تسبني ذكرت بخير
وتزعم انني مذق خنيث

جنان! خدا تیرا بھلا کرے، تو مجھے گالیاں دیتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ میں مخنث نوجوان ہوں۔

۲- وان مودتي كذب ومين
واني للذي اهوى بثوث

اور یہ کہ میری محبت جھوٹی اور پر فریب ہے اور میں جس کو چاہتا ہوں اُسے رسوا کرتا ہوں۔

۳- وما صدقت ولا ارد عليها
ولكن الملول هو النكوث

گو یہ بات سچ نہیں ہے لیکن میں اُسے جھٹلا نہیں سکتا ہاں یہ سچ ہے کہ مایوس شخص عہد پر قائم نہیں رہ سکتا،

۴- ولي قلب ينازعني اليها
وشوق بين اضلاعي حثيث

ہائے کیا کروں یہ میرا دل اُسکے بارے میں جھگڑا کرتا رہتا ہے اور شوق وصال میرے پہلو میں بیٹھا ہوا اُکسا تا رہتا ہے۔

۵ــ رأیت کلفی بہا ودوام عہدی فما لتنی کذا کان الحدیث	وہ میرے عشق اور میری ثابت قدمی کو دیکھتی ہے مگر پھر بھی وہ مجھے مایوس کرتی ہے، کیا یہی بات ہونی چاہئے تھی؟

ابو نواس نے زندگی سے تنگ آکر ایک مرتبہ جنان کو دھمکایا بھی اور کہا کہ اب بھی اگر تم میرے حال پر رحم نہ کھاؤ گی تو بس میں جان دیدوں گا اور میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا، دیکھئے وہ اس مفہوم کو کتنے عمدہ طریقہ سے ادا کرتا ہے، وہ کہتا ہے:۔

۱ــ جنانُ اِن جدت یا مناي بما آملُ لم تقطر السماء دما	جنان! اے میری جانِ آرزو، اگر تو نے وہ چیز مجھے بخش دی جسکی میں امید لیکر آیا ہوں تو آسمان خون کے آنسو نہ بہائیگا۔
۲ــ وان تمارین او تمادیت فی منعک اصبح بقفرةٍ رمما	اور اگر تو نے اب بھی شک کیا یا حرمانِ وصال کی مدت بڑھائی تو میں کسی جنگل میں جان دیکر بوسیدہ ہڈی بن جاؤنگا۔

کہا جاتا ہے کہ ان اشعار کا جنان پر بہت اثر ہوا، اور اُس نے ابو نواس کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیا اور اُس سے کسی قدر مانوس بھی ہوگئی، پھر تو اس نے اور بھی ہاتھ پاؤں پھیلائے اور چاہا کہ شادی ہوجائے مگر ابو نواس کی عادتیں اسدرجہ بگڑی ہوئی تھیں کہ خود اُسے اپنی حالت پر اعتماد نہ تھا اس لئے وہ اسکی شرط پر راضی نہ ہوا، اور جواب میں یہ اشعار اُس نے لکھ بھیجے:۔

۱ــ یشارطنی الحبیب علی الشروط ولستُ بما یشارط بالسخوط	محبوبہ میرے لئے شرطیں قایم کرتی ہے۔ حالنکہ میں ایسا نہیں ہوں کہ وہ مجھ پر کوئی مکروہ شرط لگائے
۲ــ اریٰ ترک اللواط علی عارٌ لأنی واحدٌ من قومِ لوط	میں ترک لواطت کو اپنے لئے باعث شرم سمجھتا ہوں اس لئے کہ میں ہی اسوقت قوم لوط کا تنہا نمایندہ ہوں۔

(باقی)

سید جلیل الرحمان اعظمی

زہرِ عشق

مصنفہ مرزا شوق لکھنوی۔ مرتبہ مجنوں گورکھپوری معہ مقدمہ جناب نیاز صاحب فتحپوری و مولانا عبدالماجد صاحب مجلد مع رنگین تصاویر کے۔ قیمت عہ، علاوہ محصول۔

مینجر نگار۔ لکھنو

بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں

میرے محترم دوست لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر جلال۔ ایم۔ شاہ نے جو بمبئی کے سب سے بڑے اسپتال (جے۔ جے۔ ہاسپٹل) میں سرکاری ماہرِ امراضِ جنسیہ کی حیثیت سے کئی برس سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہے ہیں، یہ مضمون "گرانٹ میڈیکل کالج میگزین" کے لئے تحریر فرمایا تھا چونکہ اس میں ایسی شخصیتوں سے بحث کی گئی ہے جو نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے باعثِ دلچسپی ہیں اور چونکہ اس میں بعض ایسی باتیں آگئی ہیں جو بجائے خود چھوٹی اور معمولی ہیں تاہم اُن سے انسانی سیرت پر اچھی خاصی روشنی پڑ سکتی ہے، اس لئے میں اس کا ترجمہ اُردو داں طبقہ کے مطالعہ کے لئے "نگار" کے ذریعہ پیش کرتا ہوں۔ اگر ہمارے ملک کے دوسرے حضرات بھی ڈاکٹر جلال شاہ کی طرح اپنے "تاثرات" قلمبند کر دیں تو یقیناً بہت سے ایسے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں گے جو اس ملک کے نوجوانوں پر اچھا اثر ڈالے بغیر نہ رہیں گے۔ بہرحال امید ہے کہ یہ مضمون اُسی دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ مترجم

جب "گرانٹ میڈیکل کالج میگزین" کے اڈیٹر نے مجھ سے اس امر کی خواہش ظاہر کی کہ میں اُن کے رسالہ کے لئے کچھ لکھوں تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ زمانۂ گزشتہ میں دنیا کی بعض مشہور ترین شخصیتوں کے ساتھ میرے جو تھوڑے بہت خاکسارانہ تعلقات رہے ہیں، اُن کا ہلکا سا خاکہ ایک مضمون کی صورت میں کھینچ دوں جو اگرچہ رسالہ کے مقاصد سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا تاہم ممکن ہے کہ قارئینِ کرام کے لئے عموماً اور موجودہ نسل کے طلبا کے لئے خصوصاً باعثِ دلچسپی ہو۔

میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں بہت سے ایسے اشخاص سے ملنے کا موقع ملا ہے جو اُس وقت یا تو بامِ شہرت پر پہونچ چکے تھے یا بعد میں اپنے اپنے حلقہ میں عظیم الشان شہرت کے مالک بنے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ ایک دو کو چھوڑ کر باقی اکابر سے میرے تعلقات کی ابتداء اُس زمانہ

میں شروع ہوئی تھی جبکہ میں لندن میں طالبعلمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بعض کا انتقال ہوچکا ہے اور بعض سے پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن گزشتہ صحبتوں کی دل خوش کُن یاد ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گی۔

گاما پہلوان اس مشہور و معروف پنجابی پہلوان نے دُنیا کا چیمپین بننے کے لئے ۱۹۰۹ء میں زبسکو سے طاقت آزمائی کی تھی۔ کشتی وائٹ سٹی، لندن کے دنگل میں ہوئی تھی۔ اُس زمانہ میں چونکہ وائٹ سٹی میں انگلستان اور جاپان کی مصنوعات کی مشترکہ نمائش ہو رہی تھی اس لئے بہت سے جاپانی پہلوان بھی انگلستان میں موجود تھے جن کی کُشتیاں روزانہ ہوا کرتی تھیں۔

گاما اور زبسکو کی کُشتی شروع ہونے سے تھوڑی دیر قبل جاپانی پہلوان زبسکو کے پاس پہونچے اس سے مصافحہ کیا اور اُس کی کامیابی کے لئے دُعاگو ہوئے۔ لیکن انھوں نے گاما کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔

جاپانیوں نے گاما سے جس کج خلقی کا برتاؤ کیا اُسے سمجھنے سے ہم قاصر تھے۔ لیکن اس واقعہ کے فوراً بعد ہی چند خوبصورت جاپانی لڑکیاں دنگل میں اُتریں اور گاما کی خدمت میں پھولوں کا تحفہ پیش کیا۔

یہ تمام کھیل پہلے ہی سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ طے پا چکا تھا اور جیسا کہ ہمیں بعد میں بتایا گیا، اس سے کسی کی ہتک یا دل آزاری مقصود نہ تھی۔ کُشتی برابر رہی اور دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ مگر زبسکو اُسی رات کو یہ بہانہ کرکے برّاعظم روانہ ہوگیا کہ "میری والدہ سخت بیمار ہیں"

میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں بہت سے پنجابیوں سے ملا ہوں لیکن میری اب تک کسی ایسے پنجابی یا کسی دوسرے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی جسے اس بات کی ترغیب دیجا سکتی ہو کہ وہ اپنی طاقت اور کمالات کے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہے۔ گاما فی الحقیقت پنجاب کا سچا، خاموش اور طاقتور انسان ہے اور چند سال قبل ہندوستان ہی میں زبسکو کو پچھاڑ چکا ہے۔

ڈاکٹر ڈیوڈسن یہ آرک بشپ آف کنٹربری تھے اور لیمبتھ پیلس میں جو کنٹربری کے لاٹ پادریوں کے رہنے کی تاریخی جگہ ہے، ہر "آلیش ویڈنس ڈے" کو سال میں ایک مرتبہ نوآبادیوں اور غیر ملکوں کے طبّی طلبا کو مدعو کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈسن نہ صرف گرجا کے سب سے بڑے عہدیدار تھے بلکہ صحیح معنوں میں ایک بڑے مدبر اور فصیح البیان مقرر بھی تھے۔ جیسا کہ "لارڈز اسپری چوال" کا قاعدہ ہے، وہ دارالامرا میں کراس بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے اور مباحث میں بھی بسا اوقات حصہ لیا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ لیمبتھ پیلس میں انھوں نے ایک بے ضابطہ جلسہ میں ہمارے متعلق کہا کہ صرف ایک جلوس ایسا ہے جو تمام شاہانہ جلوسوں سے بھی زیادہ شاہانہ ہے جنھیں وہ دیکھ چکے ہیں اور

وہ جلوس طبی طلبا کا ہے جو درس دینے والے بڑے اسپتالوں کے وارڈوں اور گیلریوں میں اساتذہ کے پیچھے پیچھے نکلتا ہے۔

گاہ بگاہ وہ مجھے لیمبتھ پیلس میں چائے اور ٹینس پر بلا کر میری عزت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ ان آرک بشپ صاحب کو ہز مجسٹی جارج پنجم آنجہانی نے پیریج کے درجے تک ترقی دیدی تھی۔ چند سال ہوئے اُنکا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے آج تک کسی مذہب کے مذہبی پیشوا کو نہیں دیکھا جس میں اس عجیب و غریب شخص کی سی مذہبی رواداری موجود ہو اور جو اُن کی طرح دوسرے مذاہب کا دل سے احترام کرتا ہو۔

مہاراجہ گائیکواڑ، بڑودہ

ہز ہائنس مہاراجہ گائیکواڑ بھی دوسرے ہندوستانی والیان ریاست کے ساتھ ملک معظم جارج پنجم آنجہانی کی تقریب تاجپوشی کے موقع پر ۱۹۱۱ء میں انگلستان تشریف لائے تھے۔ اُس زمانہ میں میں "انڈین گلڈ آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی" جس کا صدر دفتر مانچسٹر میں تھا، کی لندن برانچ کا آنریری سکریٹری تھا۔ گلڈ کی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی والیانِ ریاست سے عطیات وصول کرنے کی غرض سے ان کی خدمت میں پہونچا جائے۔ چنانچہ ہم نے قرعوں کے ذریعہ فیصلہ کیا کہ کون کون شخص کہاں جائے۔ میرے نام پر گائیکواڑ نکلا۔

میرے تمام دوستوں نے دوسرے والیان ریاست سے ملاقات کرنے یا اُن سے عطیہ لینے کی جتنی بھی کوششیں کیں، وہ سب کی سب ناکام رہیں۔ لیکن ہز ہائنس گائیکواڑ نے بہت جلد ملاقات کا وقت مقرر فرما دیا اور ازراہ نوازش مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ ملاقات کے دوران میں انھوں نے فرمایا کہ "میرے پاس تمام اُمور پر بحث کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے گلڈ کے بارے میں متعلقہ کاغذات میرے پاس چھوڑ جائیں تو میں فرصت کے اوقات میں اُن کا مطالعہ کر لوں گا۔ مگر عطیہ صرف اُس صورت میں دوں گا اگر مجھے اطمینان ہو گیا کہ گلڈ حقیقی معنوں میں ہندوستان کی خدمت کر رہا ہے۔" اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ہز ہائنس کے پاس سے ۱۰۰ پونڈ کا چک موصول ہو گیا۔

ہز ہائنس کا ہمیشہ سے یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنے تمام اُمور کو کاروباری عجلت اور پورے انہماک کے ساتھ انجام دیا کرتے ہیں اور مذکورۂ بالا واقعہ اگرچہ بجائے خود بہت ہی معمولی ہے تاہم اُس نے اُس وقت ہمارے نوجوان دماغوں کو بہت متاثر کیا تھا۔

مسز اینی بیسنٹ

مسز اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۱ء میں لندن اسلامک سوسائٹی کی زیر سرپرستی ایک جلسۂ عام میں تقریر کی تھی جس کی صدارت کی عزت مجھے نصیب ہوئی تھی۔ اُن کی تقریر کا موضوع تھا کہ "اسلام نے دُنیا کو کیا فایدہ پہونچایا ہے"۔

اپنی نہایت ہی شاندار تقریر میں انھوں نے تعدد ازدواج کے مسئلہ پر پوری وضاحت کے ساتھ بحث کی اور بتایا کہ یہی وہ ایسا اسلامی شعار ہے جس پر مغربی مصنفین نے غالباً سب سے زیادہ دے دی ہے جگہ کی قلت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں ان کی تقریر پر تفصیلاً تبصرہ کروں۔ لیکن میں صرف اتنا کہنے پر قناعت کروں گا کہ اس موضوع پر اُن کی خداداد لسانی کا یہ اثر ہوا کہ مجمع کی بہت سی غیر شادی شدہ لڑکیاں رونے اور چیخیں مارنے لگ گئی تھیں۔

مسز بیسنٹ سے میری ملاقات میرے عزیز دوست دوارکا ناتھ تیلنگ کی وساطت سے ہوئی تھی یہ صاحب جسٹس تیلنگ آنجہانی کے صاحبزادے تھے۔ دوارکا ناتھ گرانٹ میڈیکل کالج میں نہ صرف میرے ہمعصر تھے بلکہ نہایت گہرے دوستوں میں تھے۔

دو سال قبل جب مسز اینی بیسنٹ کا انتقال ہوا تو اُس وقت مسز موصوفہ کی راکھ دریائے گنگا کے مقدس پانی میں بہانے کی غرض سے لیجانے کی عزت انھی دوارکا ناتھ کو حاصل ہوئی تھی۔

میجر شاہ مرزا بیگ

میجر شاہ مرزا بیگ (دکھن) اپنے زمانہ کے بہترین پولو کھیلنے والے تھے اور دنیا کا کوئی پولو میچ ایسا نہ تھا جس میں انھیں شامل نہ کیا جاتا ہو اس لئے کہ عام خیال یہ تھا کہ وہ دُنیا کے چار بہترین کھلاڑیوں میں سے ایک ہیں۔ ایک مرتبہ وہ کاؤنٹ ڈی ماڈری کی ٹیم میں جس کا نام "ٹائیگرز" تھا، کھیل رہے تھے جس کے دیکھنے والوں میں ہز رائیل ہائنیس ڈیوک آف کناٹ بھی تھے۔ ٹورنامنٹ کے آخری کھیل میں تو مرزا نے کمال ہی کر دیا۔ میچ کے بعد ڈیوک آف کناٹ نے ازراہِ نوازش شاہ مرزا بیگ کو خاص طور سے بلا بھیجا اور فرمایا کہ "میری بیٹی شاہزادی پیٹریشیا مجھ پر زور ڈال رہی ہیں کہ میں اُن سے آپ کا تعارف کرا دوں"۔

ٹیم میں مرزا کی پوزیشن سب سے اول رہی اور اُن کا کھیل اس قدر شاندار تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پولو اور ٹینس میں اُن کے کمال سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ بہت ہی خوبصورت شخصیت کے مالک تھے جس کی وجہ سے اُن کے ہزارہا دوست اور مداح پیدا ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں انکی بے وقت موت جو پولو کھیلنے کے دوران میں ایک حادثہ کی وجہ سے ہوئی، اُن کے احباب کے وسیع حلقہ کے لئے سخت صدمہ کا باعث ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب ہم نے مصر کی "ڈبل آرمی ٹینس چمپین شپ" جیتی تو اُس وقت مجھے مرزا کا "پارٹنر" بننے کی عزت نصیب ہوئی تھی۔

مسز نائیڈو

مسز نائیڈو اپنی دلآویز شاعری کی بدولت جسے صرف ایک سرو جنی ہی لکھ سکتی ہے، کافی شہرت حاصل کر چکی تھیں اس سے بہت عرصہ قبل کہ مجھے لندن میں اُن سے ملنے کی

عزت حاصل ہوئی ہو۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جب وہ لندن تشریف لائیں تو سلطنت متحدہ انگلستان و آیرلینڈ کے شعراء نے چیدہ اصحاب کی موجودگی میں مسز پٹیس کی زیر صدارت اُن کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ لندن کے ویسٹ اینڈ بازار میں جب کبھی مسز نائیڈو سودا سلف خریدنے کی غرض سے نکلتی تھیں، ایسے مواقع پر بسا اوقات میرے ذمہ ان کی حفاظت کی خدمت سپرد رہا کرتی تھی تاکہ وہ جیساکہ وہ خود فرمایا کرتی تھیں، ضرورت سے زیادہ روپیہ صرف نہ کر دیا کریں۔ گھر پہونچنے کے بعد وہ مجھے اچھی اچھی چیزیں کھلائے بغیر نہ بھیجتیں کہ مبادا میں دوبارہ حاضر نہ ہوں۔

ڈاکٹر انصاری

خوش قسمتی سے میں ڈاکٹر انصاری سے سنہ ۱۹۰۱ء سے واقف ہوں۔ میری اُن کی پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی جبکہ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر چکے تھے اور میں ابھی "سینٹ بارتھولومیوز ہاسپٹل" میں طالبعلمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔

اُس زمانہ میں وہ لندن کے چیرنگ کراس ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن مقرر ہو گئے تھے۔ اس اسپتال کے ساتھ ایک تعلیمی درسگاہ بھی ملحق ہے اور میرا خیال ہے کہ میرا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے کہ انصاری اُن ابتدائی چند ہندوستانیوں میں سے تھے جو لندن کے کسی درس و تدریس دینے والے اسپتال میں ہاؤس سرجن کی حیثیت سے مقرر ہوئے ہوں۔

بہر حال آج بھی درس دینے والے اسپتالوں میں بالخصوص لندن کے اسپتالوں میں ہاؤس سرجن کے عہدہ پر لوگوں کی للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ انصاری کے دوستوں اور مداحوں نے جن میں زیادہ تر ہندوستانی ڈاکٹر اور طلبا تھے، اس واقعہ کی یاد میں "چیرنگ کراس ہاسپٹل" کے قریب ہی "اسٹرینڈ" کے ایک نہایت غلیشن ایبل رسٹورنٹ میں انھیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔

میزبانوں میں میں ہی اُن کا سب سے پرانا دوست تھا اور اس لئے اس شام کو جامِ صحت تجویز کرنے کا فرض بھی میرے سپرد تھا۔ چونکہ طلبا میں میں سب سے زیادہ "سینیر" تھا اس لئے ڈنر کے موقع پر صدارت کی ذمہ داری بھی میرے ہی ضعیف کندھوں پر ڈالدی گئی تھی۔

انصاری میری دائیں جانب بیٹھے تھے اور ڈاکٹر سی۔ اے۔ ایڈیین، ایم۔ ڈی، ایف۔ آر۔ سی۔ ایس ایم۔ پی جو انصاری کے زبردست مداحوں میں تھے اور اُسوقت بارتھولومیو میں علم التشریح کے لکچرر تھے، میری بائیں جانب تھے۔ یہ صاحب سب سے پہلی بار انصاری سے لندن کی "نیشنل لبرل کلب" میں ملے تھے جس کے یہ دونوں حضرات ممبر تھے۔

یہ میری پہلی تقریر تھی اور اگر دوران ڈنر میں مجھے اپنے قریب بیٹھنے والوں سے شاباشی اور اخلاقی

امداد نہ ملتی تو یقیناً میں بالکل ناکام رہتا اور ایک فقرہ بھی زبان سے ادا نہ کر سکتا۔

لیکن اس پہلی تقریر پر مجھے سب سے زیادہ شاباشی انصاری ہی نے دی۔ اس بنا پر مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں نے پورے تیس سیکنڈ میں اچھی خاصی تقریر کی ہوگی۔

میرا معمول تھا کہ میں ہر ہفتہ سہ پہر کو "چیرنگ کراس ہاسپٹل" میں انصاری سے ملنے کے لئے اُن کی قیامگاہ پر جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شام کے وقت ہم "اسٹرینڈ" میں سیر و تفریح میں مشغول تھے کہ شام کے ایک اخبار کے پوسٹر پر ہماری نظر پڑی جس میں جلی حروف میں یہ الفاظ درج تھے "برطانوی ڈاکٹروں کے ساتھ شدید بے انصافی"۔ میں نے اخبار خرید لیا اور میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سارا مضمون میرے دوست انصاری سے متعلق تھا جس میں لندن کے ایک بڑے اسپتال میں بہ حیثیت ہندوستانی کے اُن کے تقرر پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس پر زور دیا گیا تھا کہ ایسی اسامیاں ہمیشہ نوجوان برطانوی ڈاکٹروں سے پُر کی جانی چاہیں۔

ذاتی طور پر انصاری اسپتال میں بیحد ہر دلعزیز تھے اور اُن کے رفقائے کار نے اُن کے تقرر پر اخباری نکتہ چینی کے خلاف سخت غصہ کا اظہار کیا تھا۔ اس واقعہ کے ایک دو دن بعد "چیرنگ کراس ہاسپٹل" کی "گورننگ کونسل" کے چیرمین کی جانب سے ایک دفتری اعلان شائع کیا گیا جس میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ "انصاری کا تقرر محض قابلیت کی بنا پر کیا گیا ہے اور برطانوی اسپتالوں کے لئے وہ دن نہایت افسوسناک دن ہوگا اگر ہاؤس سرجنوں کی اسامیوں کا اعلیٰ اسامیوں میں شمار نہ رہیگا اور اگر قابلیت کے معیار کے سوائے اور جذبات کا لحاظ رکھا جائے گا"۔

جس زمانہ میں انصاری ہاؤس سرجن تھے، اُسی زمانہ کا یہ واقعہ ہے کہ میں اُن کے یہاں ڈنر پر مدعو تھا جب ڈنر ختم ہوگیا تو انھوں نے خلافِ توقع مجھے نہایت قیمتی سگاروں کا ایک بکس پیش کیا اور فرمایا کہ "میرے پاس ایسے بکس ایک درجن ہیں جن میں سے میں نے تمہارے لئے چھ بکس محفوظ کر دئے ہیں جو تمہیں قسط وار ملتے رہیں گے"۔

انگلستان میں سگار ایک مہنگی عیاشی شمار کیجاتی ہے اور قدرتی طور پر میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ اتنی دولت اُن کے ہاتھ کیسے لگی۔

آخرکار یہ راز خود بخود کُھل گیا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس تحفہ کی بھیجنے والی مس ماڈ ایلین ہیں جو اُس زمانہ میں عریاں رقصوں کی وجہ سے دنیا بھر میں نمایاں شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اُن کی خادمہ کسی سڑک کے حادثہ میں بری طرح زخمی ہوگئی تھی اور اسپتال میں لائی گئی تھی جہاں انصاری نے اپنے وارڈ میں اسکا

کامیابی کے ساتھ علاج کیا تھا۔ مس ماڈ ایلین نے تحفہ کے ساتھ ایک مختصر رقعہ بھی بھیجا تھا جس میں ان کی اُن تھک کوششوں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جو انھوں نے مریضہ کی بحالی صحت کے لئے کی تھیں رقعہ کے آخر میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے فنی کمال کے اعتراف میں جس کا اظہار خادمہ کے علاج کی صورت میں ہوا تھا، اس حقیر تحفہ کو قبول فرمائیں۔

جو لوگ انصاری سے بہ حیثیت ڈاکٹر کے اُن کی مابعد کی زندگی میں ملے ہیں، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مذکورہ بالا اعتراف کے وہ پورے طور پر مستحق تھے اور یہ کہ ملک بھر کے بیشمار مریض، بالخصوص غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص نہ صرف انھیں اپنا چہیتا ڈاکٹر خیال کرتے تھے بلکہ ہر اعتبار سے انھیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری اگر چاہتے تو آسانی کے ساتھ بڑی دولت کما سکتے تھے۔ لیکن وہ قدرت کے یہاں سے مختلف فطرت لیکر آئے تھے اور انھوں نے اپنے فنی فرائض کی شریفانہ بجا آوری میں اس خیال کو کبھی اپنے دل میں آنے نہیں دیا کہ وہ روپئے پیسے کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔ غریب مریضوں کے اُس اژدہام کے ساتھ بھی جو دہلی میں ان کے گھر کے مطب میں دیکھنے میں آتا تھا، اُن کی وہی روش اور توجہ تھی جو امراء، روسا اور والیانِ ریاست پر مبذول کی جاتی تھی۔

"چیئرنگ کراس ہاسپٹل" میں اپنی میعادِ عہدہ پوری کرنے کے بعد انصاری "لاک ہاسپٹل" میں اور اس کے بعد "سینٹ پیٹرز ہاسپٹل" لندن میں "ریذیڈنٹ میڈیکل آفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد انھوں نے اڈنبرا سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر ایم۔ سی۔ ایچ کی۔

میرا خیال ہے کہ انصاری ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ اس زمانہ میں اُنکی خواہش تھی کہ دہلی میں ایک عام اسپتال تعمیر کریں جہاں فیس ادا کرنے والے مریضوں کے ساتھ ساتھ مفت دوا پانے والے مریضوں کا بھی علاج کیا جا سکے۔ لیکن یہ اسکیم بار ور نہیں ہوئی اس لئے کہ ہندوستان پہونچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انھیں "آل انڈیا میڈیکل مشن" کے سرداری کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا تھا اور یہ اپنا اسپتال لیکر بہت جلد ٹرکی روانہ ہو گئے جو اُن دنوں دول بلقان کی متحدہ طاقتوں سے نہایت بہادری کے ساتھ مصروف جنگ تھا۔

مولانا محمد علی مرحوم ہی زیادہ تر اس جنگی اسپتال کے قیام کے ذمہ دار تھے اور اس کے لئے انھوں نے سارے ہندوستان سے روپیہ اکھٹا کیا تھا۔

اس اسپتال نے جو سارے کا سارا ہندوستانیوں پر مشتمل تھا، ترکی بیماروں اور زخمیوں کیلئے

نہایت مفید خدمات انجام دی تھیں۔ جنگِ بلقان کے اختتام پر یہ مشن ہندوستان واپس آگیا۔
ٹرکی سے واپسی پر انصاری رفتہ رفتہ سیاسیات میں داخل ہوتے گئے۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے خلافت کمیٹی کے ذریعہ خالص اسلامی سیاسیات سے تعلق رکھا لیکن جلدی ہی وہ کانگریس میں شامل ہو گئے جس کے وہ زمانہ مابعد میں پریسیڈنٹ بھی منتخب ہوئے — میں انصاری کی پبلک زندگی کے متعلق رائے دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ہماری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ہم مختلف راہوں پر گامزن رہیں۔
ہم دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ آخری مرتبہ میری ان سے ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی جبکہ آنریبل سر علی محمد خاں دہلوی نے جو اُس وقت لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر رہتے تھے، اُن کی آمد کے موقع پر ایک ڈنر پارٹی دی تھی۔ ہمارے عقلمند میزبان نے انصاری کی اور میری نشستیں پاس پاس رکھی تھیں اور جب ہم ملے اس وقت ہم نے زیادہ تر لندن ہی کے زمانۂ قیام کی گزری ہوئی دلچسپیوں کے بارے میں گفتگو کی اور اُس دور کے بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات کا بچپن کی مسرت کے ساتھ تذکرہ کیا جو اگرچہ بجائے خود معمولی تھے مگر ہمارے لئے وہ اپنے اندر خاص دلچسپی رکھتے تھے اس لئے کہ اُن کی خوشگوار یاد آج بھی ہمارے دلوں کو مسرور کرتی ہے۔
میں سیاسی آدمی نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے سیاست دانوں میں وہ لوگ جو سیاسی خیالات میں ان سے اختلافِ رائے رکھتے تھے، سب سے پہلے اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے کہ انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات میں سیاسی اختلافات کو غلبہ پانے کی کبھی اجازت نہیں دی۔
اپنے بیشمار مشاغل میں مصروف رہنے کے باوجود انھیں اپنے پیشہ کے ساتھ جو شغف تھا اُس میں کبھی بھی ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ وہ علم طب کی ترقیوں سے پوری طرح واقف رہتے تھے۔ بلاشبہ ان کا شمار اس پیشہ کے مسلمہ لیڈروں میں ہوتا تھا۔ انصاری "آل انڈیا میڈیکل کانفرنس" کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے جس کا اجلاس بمبئی میں ۱۹۳۳ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کانفرنس میں ہم دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور یہیں پہلی بار انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ انھیں دل کی طرف سے تشویش رہا کرتی ہے۔
اُن کی سرگرمیاں اب ختم ہو گئی ہیں، لیکن مختلف میدانوں میں اُن کے عظیم الشان کارناموں اُن کی جاذب شخصیت، اُن کی بے غرضانہ دوستی، اُن کی اعلیٰ دماغی قابلیت، اُن کی خاکساری اور وضع، اُن کی حب الوطنی، اُن کی وسیع النظری اور فرقہ وارانہ تعصبات سے اُن کی حیرت انگیز برتری

غریب اور دکھی پبلک کے ساتھ ان کا شغف اور پیار، یہ سب باتیں عرصۂ دراز تک ایک ایسی زندگی کی یاد دلاتی رہیں گی جو اپنی قوم اور ملک کی خدمت میں بسر ہوئی اور جو آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مولانا محمد علی مرحوم

ایک سہ پہر کو مولانا اور میں "ویسٹ منسٹر" میں اکھٹے جا رہے تھے "کیکسٹن ہال" سے گزرتے وقت ہمیں معلوم ہوا کہ وہاں حقوق طلب عورتوں کی طرف سے جلسہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ سیدھے ہم اندر چلے گئے، لیکن وہاں پہونچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے جلسہ میں ہمارے سوائے اور کوئی مرد نہیں۔ کچھ دیر بعد صدر جلسہ مسز پینکھرسٹ نے جو اُس زمانہ میں حقوق طلب عورتوں کی تحریک کی پریسیڈنٹ تھیں، مولانا محمد علی سے تقریر کے لئے درخواست کی۔ مولانا نے درخواست کو قبول فرما لیا اور عورتوں کو ووٹ دئے جانے کی تائید میں ایک نہایت معرکۃ الآرا تقریر فرمائی۔

جلسہ کے بعد سارا مجمع ڈاؤننگ اسٹریٹ کے مکان نمبر ۱۰ پر گیا تاکہ وزیر اعظم سے ملاقات کرے مسز پینکھرسٹ جلوس کی سردار تھیں اور ان کی خواہش پر ہم دونوں نے ان کی حفاظت کی خدمات انجام دیں۔ "ڈاؤننگ اسٹریٹ" پہونچکر ہم برطانوی وزیر اعظم کی سرکاری قیام گاہ پر پہونچے۔ مسز پینکھرسٹ نے دروازہ پر دستک دی جسے ایک ملازم نے کھولا اور اطلاع دی کہ مسٹر ایسکوئتھ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی مسز پینکھرسٹ نے اُس عمارت کی سیڑھیوں پر سے اپنے متبعین کے سامنے تقریر شروع کر دی جس سے مجمع میں کافی جوش پیدا ہو گیا یہاں تک چند عورتوں نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے، تھوڑی دیر بعد پولیس آن پہونچی اور جلوس کے بڑے سرداروں کو جن میں مسز پینکھرسٹ بھی تھیں، گرفتار کر لیا۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ہیجان آور مناظر دیکھے ہیں، لیکن جس جوش و خروش اور ندرت کا مشاہدہ میں نے اس جلوس میں کیا، اُس کا مقابلہ کوئی نظارہ نہیں کر سکتا۔

مولانا محمد علی کا سارا دن انگلستان کی مقتدر ہستیوں سے ملاقاتیں اور بحثیں کرنے میں گزر جاتا تھا لیکن دن بھر کی مشقت کے بعد وہ نہایت مہربانی اور اخلاص کی بنا پر میرے لئے نصف گھنٹہ مخصوص فرما دیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں سنجیدہ مضامین پر بحث کرنے کی مناہی تھی اور ہم لڑکپن کی مسرت کے ساتھ شہر کے واقعات حاضرہ پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ مولانا دنیا کے اُن وسیع القلب اشخاص میں سے تھے جن سے ملاقات کی عزت مجھے نصیب ہوئی اور میں نے ہمیشہ ان کی دوستی کی قدر و منزلت

کی جس کی یاد آج بھی میرے ماضی کے نہایت قیمتی خزانوں میں شمار ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب ہم سب کی بدقسمتی سے مولانا کا انتقال ہوگیا، اُسوقت جنازہ میں شرکت کرنے والوں میں میں بھی تھا۔

مسز سوکھی موجودہ نسل کے لوگوں میں یہ مینیکا کے نام سے مشہور ہیں اور جب ہم پہلی مرتبہ لندن میں ملے ہیں تو اگرچہ وہ زمانہ اُن کی نوعمری کا تھا تاہم بحیثیت آرٹسٹ کے وہ جس شہرت کی آج مالک ہیں، اس کے آثار اُسیوقت ظاہر ہو چکے تھے۔

لندن میں وہ مس لیلا رائے کے نام سے مشہور تھیں اور ہندوستانیوں کے وہاں جتنے جلسے ہوا کرتے تھے، وہ اُن سب کی روح رواں تھیں۔ اُسوقت وہ ایسی مکمل رقاصہ نہ تھیں جیسی آج کل ہیں لیکن اُس زمانہ میں بھی وہ وایولن بجانے میں سننے والوں کی طرف سے خراج تحسین وصول کیا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے مہاراجہ گائیکواڑ کے اعزاز میں استقبالیہ جلسہ منعقد کیا۔ تفریحی ناٹک کے طور پر انھوں نے تاریخ ہند کا ایک ایسا باب لیا جو اسلامی دور سے متعلق تھا اور جسے نہایت دلآویزی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا تھا۔ ہمایوں کا پارٹ ادا کرنے کے لئے میرا انتخاب کیا گیا تھا اور مجھے خوب یاد ہے کہ کھیل کے بعد انھوں نے مجھے دل کھول کر شاباشی دی تھی۔

مجھے بعد میں یہ معلوم کرکے بیحد مسرت ہوئی کہ ان کی نگاہِ انتخاب میرے ایک دوست پر پڑی اور وہ انجام کار مس لیلا رائے سے مسز سوکھی بن گئیں۔

گزشتہ آلمپک کھیلوں میں جو برلن میں منعقد ہوئے تھے، انھوں نے فنِ رقص کا جو مظاہرہ کیا، وہ چونکہ زمانۂ حال کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں اُسے نظرانداز کرتا ہوں۔

جی۔ کے۔ گوکھلے آنریبل مسٹر جی۔ کے۔ گوکھلے آنجہانی اور سر فیروز شاہ مہتا دونوں کو لندن کی "انڈین یونین سوسائٹی" نے ایک ساتھ ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اُس زمانہ میں میں سوسائٹی کا صدر تھا۔ اپنے معزز مہمانوں کا جام صحت تجویز کرتے وقت میں نے جسارت کرکے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کو مارلے منٹو اصلاحات کے بارے میں جو اُسوقت پارلیمنٹ کے سامنے زیربحث تھیں کیا پالیسی اختیار کرنی چاہئے۔

مسٹر گوکھلے نے جواب میں نہایت خوش خلقی کے ساتھ میری تجاویز کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ جب وقت آئے گا وہ اُن پر پوری توجہ مبذول فرمائیں گے۔ مگر سر فیروز شاہ مہتا نے جو ترکی ٹوپی زیب سر کئے ہوئے تھے، مجھے سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ "ہم بوڑھے اپنا وقت ضایع نہیں کر رہے ہیں بلکہ نفس معاملہ پر پوری طرح غور و خوض کر رہے ہیں"۔

پنڈت جواہر لال نہرو

جب لندن میں میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی، اسوقت وہ "انرٹمپل" میں تعلیم پا رہے تھے۔ اپنے مخصوص دوستوں کے حلقہ میں وہ "جو" کے نام سے مشہور تھے۔

وہ کسی قدر شرمیلے واقع ہوئے تھے اور کچھ کھچے سے رہتے تھے اور آسانی سے دوست نہیں بنتے تھے، بلکہ ہم میں سے جن کو وہ اپنی دوستی سے نوازتے تھے، اُن کے سامنے وہ اپنا کلیجہ تک نکال کر رکھ دیتے تھے۔

ان کے پسندیدہ خط وخال، ان کی دلوں پر قبضہ کر لینے والی مسکراہٹ، ان کے اچھے قطع کردہ کپڑے اور سجے ہوئے کمرے، ان کی شاہانہ مہماں نوازیاں اور ان کی دلچسپ بذلہ سنجیاں اور سب سے بڑھ کر اُن کا قابل تقلید ذاتی کیرکٹر اُن تمام اشخاص کی یاد سے بھلایا نہیں جا سکتا جنھیں اُس دور دراز زمانہ میں اُن کی دوستی کا شرف حاصل تھا۔

وہ لندن کے مشہور "کوئنز کلب" کے ممبر تھے جہاں کی کورٹوں میں ہم بسا اوقات ٹینس کھیلا کرتے تھے، مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی طور پر مجھے اس امر کی کبھی توقع نہ تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو سیاسی زندگی کو اختیار کر لیں گے اگرچہ یہ عیاں تھا کہ وہ صرف اُس پیشہ کو اختیار کریں گے جس سے انھیں دلچسپی ہوگی۔ اس طرح میرے لئے یہ امر بھی تعجب انگیز تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کیونکر سیاسیات میں دخیل ہو گئے۔ وہ اور میں گرانٹ میڈیکل کالج میں ہم سبق تھے اور بعد میں لندن میں ملکر ہمیں بہت مسرت ہوئی — پنڈت جواہر لال نہرو ہم دونوں کے گہرے دوست تھے۔

خان جیسا کہ ہم انھیں محبت سے پکارا کرتے تھے، ہاکی ٹیم میں "سینٹ ٹامسنز ہاسپٹل" کی طرف سے نمایندگی کرتے تھے اور ہر اعتبار سے اسپورٹسمین (کھلاڑی) تھے۔

لندن میں میرے ایک چچا کا انتقال ہو گیا اور ایسے وقت میں اپنے گھر سے دور رنج وغم سے نڈھال ہو رہا تھا، میں خان صاحب کی برادرانہ شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

پرنس لچ ناؤسکی

جنگ عظیم چھڑنے سے قبل قیصر نے جرمنی کے اس زبردست شخص کو لندن میں اس غرض سے سفیر بنا کر بھیجا تھا کہ وہ انگلستان اور جرمنی کے دوستانہ روابط کو ترقی دے

ابتدائے جولائی کی ایک رات کا ذکر ہے کہ میرے ایک رشتہ دار نے شہزادہ لچ ناؤسکی اور اس کی حسین بیوی کو "رٹز ہوٹل" میں کھانے کی دعوت دی۔ میں بھی مہمانوں میں شامل تھا۔ ڈنر کے بعد ناچ ہوا اور اُس شام کو میں نے شہزادی کے ساتھ متعدد بار رقص کیا۔ اس شہزادی کی شخصیت

میں کمال کی جاذبیت بھری ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ لندن میں بہت جلد اُن کے دوستوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

جب علی الصبح پارٹی ختم ہوئی تو جرمن سفیر اور ان کی بیوی نے ازراہِ تلطف مجھ سے فرمایا کہ "ہمارے ساتھ سفارتخانہ چلو اور وہاں قہوہ پینے کے بعد اپنے گھر چلے جانا"۔ یہ دعوت ایسی تھی جسے میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

کمرۂ سفارت میں ہم بہت دیر تک گفتگو میں مشغول رہے اور غالباً کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس پر ہم نے تبادلۂ خیالات نہ کیا ہو۔ رخصت ہوتے وقت میرے میزبان اور ان کی بیوی نے ظریفانہ لہجہ میں فرمایا کہ "اب چین کے ساتھ جا کر سو جاؤ۔ یورپ کا امن خطرہ میں نہیں ہے"۔

مگر اس واقعہ کے ایک ہی مہینہ بعد جنگ عظیم چھڑ گئی اور دنیا جنگ کی تلخ حقیقت سے دوچار ہو گئی جرمن سفیر اور ان کی بیوی کو اعلان جنگ کے بعد انگلستان سے واپس جانا پڑا۔ میں بھی ان لوگوں میں تھا جو "کارلٹن ہاؤس ٹیرس" میں جرمن سفارت سے "خدا حافظ" کہنے کے لئے گئے تھے۔

جب میں جرمن سفارتخانے سے باہر نکل رہا تھا، ٹھیک اسی وقت وزیر اعظم انگلستان مسٹر ایسکوئتھ کی بیوی بھی اسی مقصد سے وہاں داخل ہو رہی تھیں، اور عین اسو قت جبکہ میں ٹیکسی میں بیٹھنے کو تھا، میرے قدیم اور عزیز دوست توفیق پاشا بھی جو اُس زمانہ میں لندن میں ترکی سفیر تھے رخصت ہونے والے مدبر اور اُن کی بیوی سے آخری ملاقات کرنے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔

توفیق پاشا کو بھی چند دن بعد لندن چھوڑ کر جانا پڑا اس لئے کہ ترکی بھی شریک جنگ ہو گیا تھا۔

توفیق پاشا ترکی کے مشہور ترین مدبروں میں شمار ہوتے تھے۔ ابھی حال ہی میں میں نے دلی افسوس کے ساتھ اُن کے انتقال کی خبر پڑھی۔ مرحوم مجھ سے عزیزانہ شفقت سے پیش آتے تھے اور ہمیشہ جلال پاشا کہکر پکارا کرتے تھے۔

توفیق پاشا کے مکان پر میری دنیا کے جن بعض مشہور ترین لیڈروں سے ملاقات ہوئی، انہیں سے ایک انور پاشا تھے اور دوسرے ڈاکٹر سن یٹ سن۔

اول الذکر بلاشبہ دنیا کے نہایت خوبصورت اور وجیہہ شخص تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک زبردست اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں کچھ ایسا جادو بھرا تھا کہ ان کی شخصیت کئی لحاظ سے بے نظیر کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سن یٹ سن کئی سال قبل لندن کے مڈل سکس ہاسپٹل میں طالب علم رہ چکے تھے اور

بعد میں کئی مرتبہ اُن کا لندن آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے چین کی شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے اور اس کی بجائے جمہوریت قایم کرنے کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ابھی یہ طالب علم ہی تھے کہ ایک شب کو بہت رات گئے وہ لندن کے چینی سفارتخانہ کے پاس سے گزرے۔ سفارت خانہ کے عملہ نے انھیں پکڑ لیا اور کئی دن تک انھیں محبوس رکھا۔ لیکن ایک ملازم کی امداد سے وہ اس قابل ہو گئے کہ ڈاکٹر کینٹلی کو اپنی گرفتاری کی اطلاع دے سکیں جو "مڈل سکس ہاسپٹل" میں سن یٹ سن کے زمانۂ طالب علمی میں پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر کینٹلی فوراً برطانوی وزارت خارجہ میں گئے اور سکریٹری کے ذریعہ چینی حکومت کے نام ایک "ضروری یادداشت" بھیجی جس کا نتیجہ سن یٹ سن کی رہائی کی شکل میں نکلا۔ رہائی کے بعد وہ کئی سال تک لندن میں مقیم رہے۔

زمانۂ حال کی تاریخ جاننے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ چین کی تاریخ کے بدلنے میں انھوں نے کتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔ چینی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جانے پر جب وہاں جمہوریت قایم ہوئی تو یوان شی کے اُس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ سن یٹ سن پس پردہ رہ کر کام کرنا زیادہ پسند کرتے تھے مگر رائے عامہ نے یوان شی کے کی وفات پر انھیں مجبور کیا کہ وہ صدارت کی ذمہ داری قبول کریں۔ چنانچہ کئی سال تک اپنے ملک کی مخلصانہ خدمت کرنے کے بعد وہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

تمام چینی قوم نے رضاکارانہ چندہ کر کے اُن کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا جو ثبوت ہے اس امر کا کہ انھوں نے اپنے پیارے ملک کی کسقدر شاندار خدمت انجام دی تھیں۔

مہاتما گاندھی

اگست ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظمیٰ چھڑی ہے تو اُسوقت مہاتما گاندھی انگلستان ہی میں تھے جس مشن پر وہ وہاں تشریف لائے تھے وہ بلاشبہ ہندوستان کے باہر برطانوی نوآبادیوں بالخصوص جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی ناقابلِ اطمینان پوزیشن سے متعلق تھا۔ وہ ابھی برطانوی سلطنت کے دارالسلطنت لندن میں اُن کی خاطر مصروف جنگ تھے کہ تمام سلطنت کو یکایک موت وحیات کی ایسی کشمکش میں شریک ہونا پڑ گیا جو تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی جو چار سال کی طویل اور صبر آزما مدت تک جاری رہی اور جس کے اثرات سے ابھی تک نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہوئی۔

انگلستان کے اعلانِ جنگ کر دینے پر مہاتما گاندھی نے بیمار اور زخمی ہندوستانیوں کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ انھیں لندن میں رنگروٹ بھرتی کرنے کے لئے اسٹیشن کھولنے کی سرکاری اجازت مل گئی اور انھوں نے سلطنت متحدہ برطانیہ کے مقیم ہندوستانیوں کے نام اپیل بھیجی

اور انسے " ایمبولنس کور" میں شریک ہونے کی درخواست کی۔ کچھ عرصہ بعد انڈین والنیٹرز ایمبولنس کور"
کی حیثیت سے اس کا نام گزٹ میں چھپا، لیکن ہم اسے محبت کی بنا پر آئی۔ وی۔ اے۔ سی کہکر پکارا کرتے
تھے۔ لفٹنٹ کرنل سی۔ بیکر۔ آئی۔ ایم۔ ایس اس کور کے کمانڈنگ آفیسر مقرر ہوئے۔

بہت سے ہندوستانیوں نے جن میں زیادہ تر طلبا تھے، مہاتما کی آواز پر لبیک کہا میں نے
بھی دوسرے طلبا کی طرح مطالعہ کو عارضی طور پر خیر باد کہدیا تھا اور پرائیویٹ حیثیت سے کور میں
شامل ہوگیا تھا۔

مہاتما گاندھی جن کے ساتھ بسا اوقات ہز ہائینس آغا خاں بھی ہوتے تھے، "ریجنٹ پارک" میں
رنگروٹوں کی پریڈ دیکھنے کی غرض سے تشریف لایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ "پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ" میں
بھی وزٹ (معائنہ) کے لئے آیا کرتے تھے جہاں ہمیں فرسٹ ایڈ اور ایمبولنس کے کام کی تعلیم
دی جاتی تھی۔

مہاتما گاندھی کو بلاشبہ پہلے سے ایمبولنس کے کام سے واقفیت تھی جسے انھوں نے جنگ بوئر
کے دوران میں میدانِ جنگ میں حاصل کیا تھا وہ پریڈ کے موقع پر اور بے ضابطہ جلسوں میں بھی اکثر
اوقات تقریریں کیا کرتے تھے اور جس انسانی خدمت میں ہم مصروف تھے، اس کی عظمت ہمارے ذہن نشین
کرایا کرتے تھے اور درحقیقت یہ وہ شریفانہ فعل ہے جو ذات پات کی قیود سے بالاتر ہے اور جو اسقدر
اعلیٰ ہے کہ ہمیشہ ہماری بہترین کوششوں اور توجہات کا مرکز بن سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کے ہمت افزا الفاظ سے ہمیں اپنے کام میں ہمیشہ ترغیب و تحریص ملتی رہتی تھی اور
ان کی وجہ سے ہم میدانِ جنگ میں اور زیادہ اہم خدمات بجالانے کے قابل ہوجایا کرتے تھے۔ یہ ہماری
ابتدا تھی اس لئے کہ اصل کام وہ تھا جو ہمیں بعد میں میدانِ جنگ میں کرنا پڑا۔

کیمپ میں نہایت سخت ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد ہمیں اصل خدمت کا موقع فرانس میں
ہندوستانی فوج کے پہونچنے سے چند دن قبل ملا۔ میں اتفاق سے اُس پہلے گروہ میں شامل تھا جو
"نٹیلے ہاسپٹل" بھیجا گیا جہاں "رائل وکٹوریہ ہاسپٹل" کا ہندوستانی شعبہ زخمیوں اور بیماروں کے لئے
کھولدیا گیا تھا۔ ہمارے پہونچنے کے بعد ہی زخمیوں کی آمد شروع ہوگئی۔

نٹیلے میں ہمارے افسروں میں لفٹنٹ کرنل پی۔ شارمین، میجر آر۔ ایچ نٹ جو حال ہی میں حکومت
بمبئی کے سرجن جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں، میجر سی۔ ایل۔ ڈن اور میجر جے ایچ میکڈانلڈ
خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ہز مجسٹی ملکۂ معظم بادشاہ جارج پنجم آنجہانی اور ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ بھی نیٹلے میں کبھی کبھار بیماروں اور زخمیوں کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے آیا کرتے تھے۔ میں نے ۱۹۱۵ء میں کور سے استعفا دیدیا تاکہ بارتھولومیو میں اپنے مطالعہ کو ختم کر لوں۔

شریف حسین

ہز مجسٹی شاہ حسین والی حجاز نہایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے اور جنگ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے اُن سے ملکر بیحد مسرت ہوئی۔

جو ہندوستانی سپاہی "اجپشن ایکس پیڈیشنری فورس" میں تھے اور مصر، فلسطین، شام اور ٹرکی میں جنگی خدمت بجا لا رہے تھے، اُن کی ایک بہت بڑی پارٹی کے ساتھ مجھے ۱۹۱۹ء میں حج کرنیکی غرض سے حجاز بھیجا گیا۔ میجر سی۔ ایل۔ پورٹر جدہ تک ہماری پارٹی کے انچارج رہے۔ میں اس جماعت کا سینیر میڈیکل آفیسر تھا جو تقریباً ۲ ہزار افسروں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

جدہ میں میں "آفیسر کمانڈنگ" اور "سینیر میڈیکل آفیسر" کے متحدہ عہدہ کے فرائض ادا کر رہا تھا حالانکہ میری پوری ملازمت محض ۱½ سال کے قریب تھی۔

مکہ معظمہ کے دروازہ پر ہز رائل ہائینس امیر فیصل نے جو بعد کو عراق کے بادشاہ بنے، ہمارا استقبال کیا۔ اس مقدس شہر میں ہمارے پہونچ جانے کے بعد ہز مجسٹی شریف حسین نے بھی اپنی وزٹ سے ہمیں سرفراز فرمایا۔ حجاز کے دوران قیام میں وزیر جنگ جنرل قسونی پاشا ہمارے آرام و آسایش کا خیال رکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن سے بہتر میزبان ملنا مشکل ہے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے حج کے اختتام پر بادشاہ نے فریضۂ حج کی مسرت بخش تکمیل کی خوشی میں ایک دربار منعقد فرمایا۔ مجھے اور میرے ساتھی افسران کو شاہی خاندان کے افراد یعنی بادشاہ کے چاروں بیٹوں امیر علی، امیر فیصل، امیر عبداللہ (جو آجکل شرق اردن کے بادشاہ ہیں) اور امیر زبیر کے قریب ہی نشستیں دی گئیں۔

دربار میں ایک عرب نے بادشاہ کی اجازت سے چند اشعار سنائے جو عید الضحیٰ کی مبارک تقریب پر لکھے گئے تھے۔ لیکن جیسا کہ بعد کو معلوم ہوا، ان اشعار کا تعلق اس تقریب سے مطلق نہ تھا بلکہ وہ ایتہ بادشاہ کی ذات سے متعلق تھے اور اُن میں شروع سے آخر تک سوائے جھوٹی تعریفوں کے اور کچھ نہ تھا جب نظم پڑھی جا چکی تو عرب شاعر نے اسے نہایت ادب و احترام کے ساتھ آگے بڑھکر بغرض شرف قبولیت خدمتِ شاہی میں پیش کیا۔

ہز مجسٹی نے اسوقت تمام حضارِ دربار پر نظر ڈالی اور میرے ہاتھ میں مصری کوڑا دیکھکر جلدی سے

میری طرف لپکے اور کوڑا چھینکر نہایت بے دردی سے اس عرب کو پٹینا شروع کر دیا۔ ہز مجسٹی غصہ سے کانپ رہے تھے مگر اُسے برابر مارتے جا رہے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ "آج کے دن تو نے مجھ جیسے خاطی انسان کی تعریف کرنے کا ناقابلِ معافی گناہ کیوں کیا حالانکہ یہ دن وہ ہے کہ آج سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی تعریف کا سزاوار نہیں"۔

واپسی پر جب ہم جدہ پہونچے ہیں تو وہاں میری ملاقات ایک مشہور و معروف شخص (کرنل لارنس) سے ہوئی جس کے ساتھ میں بہت دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ بعد کو ہماری دوسری ملاقات شام میں ہوئی۔

عربی زبان میں ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "سوائے لارنس کے اور کوئی شخص سرپٹ اونٹ پر نہیں چڑھ سکتا"۔

یہ سچ ہے کہ لارنس سے میری ملاقات صرف دو مرتبہ ہوئی، لیکن اس کی صاف گوئی، سچائی، اور محبت کا میرے دل پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ جب کچھ عرصہ قبل میں نے تکلیف دہ حالات میں اسکے انتقال کی خبر اخبارات میں پڑھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے کسی عمر بھر کے دوست کا انتقال ہو گیا۔

ضیاء الدین احمد "برنی"

بلاغ امرتسر

ہندوستان بھر میں اپنی قسم کا تنہا دینی ماہ نامہ جس نے کامل جرأت و صاف گوئی سے غیر قرآن انسانی کتب کی الہامیت و حجیت کا انکار کر دیا ہے جس کی آواز چودہ سال سے اقصائے مذہب میں گونج رہی ہے۔ حق پسند طبیعتیں قبول کرتی ہیں۔ قرآن کے بعد کوئی وحی نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی و رسول نہیں ہیں تاویل و تفرقہ کی بے اعتدالیاں سم قاتل ہیں۔ بلاغ کا نصب العین بحکم قرآن یہ ہے کہ مسلمانوں کو فروعی اختلاف کے باوجود آپس میں متحد العمل ہو جانا چاہیئے۔ اور رسم تکفیر و تفسیق کو دوسرے وقت کیلئے اٹھا رکھنا چاہیئے۔ بلاغ تعلیم اسلام کو عقلی (Rational) رنگ میں پیش کرتا ہے

قیمت سالانہ تین روپے۔ (ملنے کا پتہ) منیجر بلاغ امرت سر (پنجاب)

جوش کی ایک شاعرانہ لغزش؟

میں جوش صاحب سے واقف نہیں، نہ وہ مجھے جانتے ہیں، اس لئے کسی کا یہ سمجھنا کہ میں نے سطور ذیل ان کی حمایت میں سپرد قلم کی ہیں، سوء ظن کے سوا اور کسی شے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ میرا مقصد ایک خالص ادبی مسئلہ پر روشنی ڈالنا ہے اور بس۔ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں یورپ سے واپسی کے بعد جب میں لکھنؤ پہونچا تو سب سے پہلے جس چیز کے دیکھنے کی مجھے خواہش ہوئی وہ رسالہ "نگار" تھا۔ جولائی کا "نگار" میں نے دیکھا۔ اس میں جوش صاحب کی ایک نظم پر جناب نیاز نے تبصرہ کیا ہے اور آخری شعر کی تنقید پورے دو صفحے پر تمام ہوئی ہے۔ شعر یہ ہے:۔

نگاہ روبرو، اے روح نعمتِ داریں
ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

نیاز صاحب کا بیان ہے کہ "جناب جوش کو اپنے اس شعر پر بہت ناز ہے اور غالباً ایک اسی شعر کیلئے ساری نظم لکھنے کی زحمت گوارا کی گئی ہے۔ اگر واقعی ان کا یہ پندار صحیح ہو تو بھی اس کا امتیاز انھیں حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اقبال اسی خیال کو بہت پہلے اس طرح ظاہر کر چکا ہے کہ:۔

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ"

نیاز صاحب کا یہ اعتراض تو نفسِ مضمون کے متعلق ہے۔ اب رہے شعر کے الفاظ۔ اس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "سب سے بڑی غلطی جوش نے "یزداں شکار" کی ترکیب استعمال کرنے میں کی ہے۔ انھوں نے اس ترکیب سے وہی مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے جو اقبال کے مصرع سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہاں معنی بالکل اُلٹے ہو گئے۔ جوش سمجھتے ہیں کہ "یزداں شکار" کے معنی "یزداں کو شکار کرنے والے" کے ہیں۔ درانحالیکہ اس کے معنے ہوئے "شکار یزداں" کے یعنی "وہ جسے یزداں نے شکار کیا ہو"۔

جوش کی ترکیب غلط ہونے کے دو بڑے سبب نیاز صاحب نے بیان کئے ہیں:۔

(۱) چونکہ لفظ شکار کسی مصدر سے مشتق نہیں اور نہ وہ اسم فاعل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اسلئے

اس کے معنی شکار کرنے والے کے کبھی نہیں آتے اور (یزداں شکار) اس معنی میں استعمال کرنا جس میں جوش نے استعمال کیا ہے بالکل غلط ہے۔

(۲) چونکہ شکار اسم ہے اس لئے دوسرے اسم کے ساتھ اس کی نسبت دو ہی صورتوں سے ہو سکتی ہے یعنی صفت و موصوف کی حالت میں یا مضاف و مضاف الیہ کی حالت میں ظاہر ہے کہ یہاں نسبت صفت و موصوف کی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے لامحالہ مضاف و مضاف الیہ کی نسبت ماننا پڑے گی اور وہ بھی مقلوب اور اس صورت میں "یزداں شکار" کے معنی سوائے "شکار یزداں" کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے جو جوش کے مفہوم و مدعا کا بالکل ضد ہے"۔

نیاز صاحب کا یہ کہنا یقیناً درست ہے کہ لفظ شکار کسی مصدر سے مشتق نہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شکار اسم ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ کبھی اسم فاعل کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کی ترکیبیں اساتذہ کے کلام میں میری نظر سے گزری ہیں لیکن اُسوقت کوئی ایسا شعر مجھے یاد نہ تھا جو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے چند روز ہوئے کہ دوران مطالعہ میں اس قسم کے اشعار مجھے مل گئے جن سے قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ "پیمبر شکار" جس معنی میں جوش نے استعمال کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

امیر خسرو علیہ الرحمہ (جن کی شاعرانہ بزرگی اور زباندانی کو اہل زبان نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ خانِ شہید بن سلطان غیاث الدین بلبن نے جب اُن کا کلام شیخ سعدی کو بھیجا تو شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدر دانی کے لائق ہے[1]۔ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرۂ شعراء میں لکھا ہے کہ میرزا بایسنغر امیر خسرو کے خمسہ کو نظامی کے خمسہ پر ترجیح دیتے تھے۔) اپنی مشہور مثنوی "آئینۂ سکندری" میں جہاں سکندر کی بزم آرائی کی تصویر کھینچی ہے، خوبانِ بزم کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

صنوبر قدانے چو گلنار تر، | برخسارہ خوں کردہ گل را جگر
ہمہ نازپرورد و نازک خرام | مہ نیمہ و آفتاب تمام،
مسلسل بسے دل بگیسوے شاں | معلق جہانے بہر موئے شاں
نہفتہ بعنبر گل خویش را | نظر بستہ چشم بد اندیش را
بہر بازی از نرگس پر خمار | خدنگ افگنان و فرشتہ شکار

ظاہر ہے کہ آخری شعر میں "فرشتہ شکار" کی وہی ترکیب ہے جو جوش کے شعر میں "پیمبر شکار" کی ہے

[1] شعر العجم شبلی۔ جلد دوم۔ تذکرہ شیخ سعدی۔

اور خسرو نے "فرشتہ شکار" کے معنی فرشتہ کو شکار کرنے والے ہی کے لئے ہیں۔ جو نیازؔ صاحب کے نزدیک "بالکل غلط" ہے۔

اگر کسی کے نزدیک قواعد صرف و نحو کی رو سے یہ ترکیب صحیح نہیں تو صرف و نحو کے وہ قواعد انہی کو مبارک رہیں۔ جوشؔ کے لئے طوطیٔ ہند کے کلام سے استناد کرنا بالکل کافی ہے۔ اور اس مثال کے بعد کسی دوسرے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تاہم تلاش و جستجو سے اس قسم کے اور شواہد بھی مل سکتے ہیں۔ چنانچہ کسی اُستاد کا شعر ہے:۔

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند   فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

حسنِ اتفاق سے اس شعر میں خود "پیمبر شکار" موجود ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو جوشؔ نے سمجھے ہیں یعنی "پیمبر کو شکار کرنے والا"۔ غالباً اس مثال کے بعد نیازؔ صاحب کو جوشؔ کی غلط فہمی پر اصرار نہ ہوگا اور وہ تسلیم کر لیں گے کہ جوشؔ نے یزداں شکار کی ترکیب استعمال کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔

"پیمبر شکار" کے علاوہ اس شعر میں ایک اور مرکب "فرشتہ صید" بھی موجود ہے جس کی ترکیب پیمبر شکار جیسی ہے اور جس کے معنی فرشتہ شکار یا فرشتہ کو شکار کرنے والے کے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ "شکار" کے علاوہ "صید" بھی ایک ایسا لفظ ہے جو شکار کی طرح اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کیا عجب کہ تلاش سے اس قسم کی اور مثالیں بھی دستیاب ہو جائیں۔

نیازؔ صاحب کا خیال ہے کہ جوشؔ کا زیرِ بحث شعر اقبالؔ کے اس مصرعہ سے ماخوذ ہے:۔

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

یہ قیاس صحیح ہو یا نہ ہو لیکن بظاہر خود اقبالؔ نے یہ خیال فارسی کے اس شعر سے لیا ہے:۔

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند   فرشتہ صید و پیمبر شکار یزداں گیر

"پیمبر شکار" اور "یزداں بکمند آور" میں اتنا قریبی تعلق یقیناً نہیں ہے جتنا "یزداں گیر" اور "یزداں بکمند آور" میں ہے۔ لہٰذا اگر یہ مضمون جوشؔ کا زادۂ طبیعت نہیں تو اقبالؔ کو بھی اس کی مالکیت کا حق نہیں پہونچتا۔ اگرچہ خود میرے نزدیک یہ بالکل ممکن ہے کہ جوشؔ اور اقبالؔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی کہیں سے اخذ نہ کیا ہو بلکہ وہ صورت واقع ہوئی ہو جسے اصطلاح میں توارد کہتے ہیں۔

عندلیب شادانی

(نگار) یہ مقالہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔اے، پی ایچ ڈی کا ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں اور اس زبان کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔

لفظ "شکار" کے اس مخصوص طریق استعمال کے جواز میں امیر خسرو یا کسی اور ہندی شاعر کے کلام سے سند پیش کر دینا، ممکن ہے ان کے لئے باعث اطمینان ہو، لیکن میں کسی غلطی کو اس لئے کبھی صحیح نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ایک سے زاید آدمیوں نے کی ہے۔ غلطی ہمیشہ غلطی رہے گی خواہ اس کا مرتکب کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو۔

کسی ترکیب یا لفظ کے صحیح استعمال کا علم صرف دو طریقوں سے ممکن ہے، ایک یہ کہ اس زبان کی لغت اور قواعد سے مدد لیجائے یا پھر یہ کہ مستند اہل زبان کے کلام میں جستجو کی جائے۔ از روئے لغت و قواعد تو ہمارے فاضل مقالہ نگار بھی اس کی غلطی کے قایل ہیں، رہا اہل زبان کے کلام سے استناد سو افسوس ہے کہ وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔

امیر خسرو کے علم و فضل سے کسی کو انکار نہیں اور فارسی دانی کے لحاظ سے ان کا وہ مرتبہ ہے جو ہندوستان میں اس وقت تک کسی کو حاصل نہیں ہوا، لیکن وہ اہل زبان یقیناً نہ تھے اور "فارسی محاورہ" کے استعمال کے باب میں ہندی نژاد ہونے کی حیثیت سے ان کا کلام بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی غلطی و لغزش تسلیم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا ہوں بشرطیکہ مجھے کوئی سمجھا دے، البتہ غلط کو صحیح باور کر لینے کی یہ وجہ کہ کسی اور بڑے شخص نے بھی یہی غلطی کی ہے، میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی اور نہ آئے گی۔ شاعری میں ایک عنصر معنی کا ہوتا ہے، دوسرا الفاظ و محاورات کا۔ پھر جس حد تک معنی کا تعلق ہے اس میں عرب و عجم، ایران و ہندوستان کی قید نہیں ہر شخص دوسرے سے بڑھ جانے کا مدعی ہو سکتا ہے، لیکن جب سوال زبان کا آئے گا تو اہل زبان کے مقابلہ میں، غیر اہل زبان کی اپچ کو رد کرنا ہی پڑے گا۔

مثلاً اقبال کو لیجئے کہ معانی کے لحاظ سے ان کی فارسی شاعری کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ایران میں اس وقت کوئی ان کا مقابل نظر نہیں آتا، لیکن زباندانی کے لحاظ سے نہ اقبال نے کبھی اس پر فخر کیا اور نہ اس باب میں ان کا کوئی شعر سنداً پیش کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان کو لیجئے کہ خود ہندوستان کے اندر کیسے کیسے ماہر اس کے موجود ہیں، اور کیسی کیسی بلند پایہ تصانیف ان کی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی یہ عظمت محض مفہوم و معنی کے لحاظ سے ہے جس وقت صحت زبان کا کوئی جھگڑا پیدا ہوگا تو استناداً انگلستان ہی کے کسی مصنف کا کلام پیش کیا جائیگا۔

یہی حال خسرو کا تھا کہ اپنی خداداد غیر معمولی ذہانت سے انھوں نے فارسی کیا، عربی و بھاشا میں بھی شاعری کی، لیکن کیا آپ کسی اہل عرب یا ہندی نژاد شاعر کے سامنے ان کا کلام رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں

کہ خسرو کی عربی زبان اور ہندی بھاگھا کا مرتبہ وہی ہے جو تمہاری زبان کا۔

امیر خسرو کے باپ ترک تھے ایرانی نہ تھے، ماں بھی ان کی ہندی تھیں، ایرانی نہ تھیں وہ خود پیدا ہوئے یہیں اور کبھی ایران میں رہنے کا اتفاق نہ ہوا، اس لئے ان کے کلام کو فارسی زبان کی صحت میں استناداً پیش کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مفہوم و معنی کی بلندی اور تنوع کلام کے لحاظ سے ان کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ ہندوستان کیا ایران و عرب میں بھی کوئی ان کا مثل مشکل سے پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ دعوے کیا جائے کہ ان کا کلام غلطیوں سے پاک تھا (اور غلطیاں بھی زبان کی!) تو معاف فرمائیے میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں۔ امیر خسرو جب خود اپنے کلام پر نگاہ انتقاد ڈالتے ہیں تو ان کو متعدد غلطیاں نظر آتی ہیں اور وہ ان کا اعتراف بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:۔ چوں سپر و طرز ہر سو ادم پس شاگردم نہ اوستادم۔ لیکن ہمارے فاضل مقالہ نگار اس باب میں امیر خسرو کے کہنے پر بھی اعتماد نہیں کرتے، اور اسے وہ خسرو کی شاعرانہ انکساری تصور فرماتے ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم نے امیر خسرو کی شاعری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس میں کلام نہیں کہ نہایت ہی حسن ظن سے لکھا ہے (اور اس میں شک نہیں کہ خسرو کی مجمع کمالات ذات اسی حسن ظن کی مستحق تھی) تاہم وہ بھی اتنا لکھنے پر مجبور ہو ہی گئے کہ:۔

لیکن لغزشیں کون بتائے، یہ کس کا منہ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں "کہ بعض کلام میں لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی ہے اور بعض جگہ بالکل تکلف و آورد ہے"

مولانا شبلی کا دبی زبان سے یہ کہنا ہی سب کچھ کہہ ڈالنا ہے اور اگر وہ قدامت پرست طبقہ کے انسان نہ ہوتے اور خیال کی آزادی انھیں رائے عامہ سے زیادہ عزیز ہوتی، تو شاید وہ زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بتا سکتے کہ خسرو کے یہاں کیا کیا اور کس کس قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

میں خود خسرو کا بڑا مداح ہوں اور ان کو ہندوستان کا بہترین شاعر سمجھتا ہوں، لیکن یہ حسن ظن ان کی طرف کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی میں نے قایم نہیں کیا کہ ان کا کلام یکسر اغلاط سے پاک ہے یا یہ کہ اگر کوئی غلط بات ان کی زبان سے نکل جائے تو میرا فرض ہے کہ اسے صحیح سمجھوں۔

اگر ہمارے دوست بجائے خسرو کے حوالہ دینے کے خود اپنی ذاتی رائے کی بنا پر اس ترکیب کی صحت کا دعوے کرتے تو میں زیادہ قدر کرتا کیونکہ اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے

ہیں تقلید نہیں ہے بلکہ اجتہاد ہے استمساک بالغیر نہیں بلکہ اعتماد علی النفس ہے، لیکن ان کے منھ سے یہ سُنکر کہ "طوطیِ ہند کے کلام سے استناد کرنا کافی ہے اور اس کے بعد کسی دوسرے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی، مجھے افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ افسوس اس لئے کہ ہم لوگوں کی یہ مرعوب ہوجانے والی ذہنیت مذہب سے گزر کر ادبیات تک پہونچ گئی ہے اور حیرت اس لئے کہ یہ بات ایسے شخص کے منھ سے نکلی ہے جو عرصہ تک آزادیِ فکر و خیال اور حریتِ رائے و ضمیر کی پرستش کرنے والے ملک میں زندگی بسر کر چکا ہے۔

ہمارے عزیز دوست نے استناداً ایک شعر اور پیش کیا ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلا سکے کہ کس کا ہے۔ اگر یہ شعر واقعی کسی مستند ایرانی شاعر کا ہے تو بیشک، مجھے اس ترکیب کی صحت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، لیکن تاوقتیکہ اس کا اطمینان نہ ہو جائے مجھے حق حاصل ہے کہ اپنی رائے پر بدستور قایم رہوں۔

مجھے امید ہے کہ جناب شاداؔنی اپنی جستجو کو برابر جاری رکھیں گے اور اگر کوئی شعر واقعی قابل استناد نظر آیا ہے تو مجھے مطلع فرمائیں گے لیکن یہ پھر عرض کردوں گا کہ جستجو کا میدان ایران ہی ہو اور ایران میں بھی وہ طبقہ جو واقعی زبان کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتا ہے مولانا روم کی مثنوی یا اسی قسم کی اور تصانیف سے اگر کوئی استناد انھوں نے پیش کیا تو وہ قابل قبول نہ ہوگا۔

بہار

مؤلفہ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارنپور

گلدستۂ "بہار" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یوں سمجھئے کہ شعراء کی پاکیزہ زبان میں حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک ۸ ضخامت ۲۳۶ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب۔ دار المصنفین۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

خُدا کا انصاف

(ڈرامہ)

ان فتاویٰ کی بنا پر جو اکابر علمائے اسلام نے اڈیٹر نگار کے استفتاء پر
تحریر فرمائے تھے اور جنوری ۳۱ء کے نگار میں شایع ہوئے تھے

استفتاء کا مفہوم یہ تھا:-

"ایک پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان ہے لیکن زندگی اسکی مکر و فریب میں بسر ہوتی ہے - دوسرا کافر برہمن ہے جو رات دن مورتیوں کی پوجا پاٹ کرتا ہے لیکن اخلاق کے لحاظ سے نہایت پاکیزہ انسان ہے - ان دونوں میں کون ناجی ہے اور کون ناری"

اس استفتاء کی نقلیں ۳۲ علمائے کرام کو بھیجی گئی تھیں، جن میں سے سولہ نے جواب دیا- ان پر انتقادی نظر ڈالتے ہوئے میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جو یہاں درج کیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ علمائے اسلام کا نظریہ نجات کیا ہے:-

ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے، تو انکو چار علحدہ علحدہ قسموں میں جدا کیا جا سکتا ہے - ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی، دوسری وہ جسے ہم "مذبذبین" کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں، تیسری وہ جس کا تعلق "راسخون" سے ہو اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اعتراف کرتی ہے -

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف ایک مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئے گی کہ انھوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے، کیونکہ نہ انھوں نے جواب میں اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ مقام درج کیا جس سے کچھ سراغ چل سکتا لیکن شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ لفافہ کے اوپر ڈاک خانہ ایک مہر بھی ثبت کر دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے

کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو پتہ چلنا مشکل تھا کہ یہ کس بزرگ کی تحریر ہے، کب لکھی گئی اور کہاں سے آئی؟

اس کے بعد جو جواب دیا گیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے کہ:۔

"سوال تنقیح طلب ہے جو تحریر ہے خالی از تکلف نہیں۔ ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"۔ مولانا نے غالب کے انداز میں کوئی ادق شعر تصنیف فرمایا ہے جس کے بعض درمیانی حصے ترک کئے گئے ہیں۔ اور اپنے نزدیک ایسا مسکت جواب دیا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی بلیغ جواب فریق ثانی کو اس درجہ تکمیل کے ساتھ ساکت کر سکتا ہو۔

مولانا کا مدعا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ:۔ "اس استفسار یا استفتار پر بعض تنقیحیں (عدالتی نہیں بلکہ دینی و مذہبی) قائم ہونا چاہئے اور ان تنقیحوں کے قائم کرنے میں انھیں تکلف ہے، تکلیف کا اندیشہ ہے، اس لئے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے، کیونکہ نہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے کی زحمت اختیار کرے گا۔ اور نہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے گا یہی وہ "ناوک فرمائی" ہے، جو سودا کے زمانہ میں صرف "مرغ قبلہ نما" کو تڑپا دیتی تھی، لیکن اب "حطیم کعبہ" کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسائل روزہ نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے۔ جو فلسفۂ مذہب سے متعلق ہو یا جو کسی اصولی گفتگو کی طرح ڈالنے والا ہو۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جدید سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنسرویٹو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حسب ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے:۔

"قاضی صاحب بھوپال۔ مفتی صاحب رام پور۔ مفتی صاحب حیدر آباد۔ مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند۔ مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ۔ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب دہلی۔ مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی۔ مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی۔ مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ۔ مولانا محمد عبد العزیز صاحب۔ مولانا محمد سجاد صاحب"۔

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے بہرحال اُسے ناجی ہونا ہے۔ بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہوا اور بت پرست کافر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔ غیر جانبدار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے والی ذہنیت مولانا عبد الستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اول الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ "لب کشائی" نہیں کر سکتے اس کا علم مالک الملک کو ہے۔

اسی طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھدیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہو کہ کون ناری ہو اور کون ناجی۔

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا۔ جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ :۔

"دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اُس "لیکن" پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے۔ ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

افراد ڈرامہ

طاہرہ ۔۔ ایک نوجوان لڑکی
بلقیس ۔۔ ایک جوان عورت
حبیب الدین ۔ ایک مرد
سدا سُکھ ۔ برہمن
ضرغام الدین ،، ایک مسلمان پیر
کتبائیل ۔ فرشتۂ حساب و کتاب (فرضی نام)
کیکائیل ۔ فرشتۂ میزان (فرضی نام)

(میدان حشر، دوپہر کا وقت، آفتاب سوا نیزے بلند ۔ آدمیوں کا مضطرب ہجوم ۔ ہر طرف شور و ہنگامہ ۔ ایک بلند ٹیلے پر میزان عدل قایم ہے اور کیکائیل آبنوسی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ قریب ہی کتبائیل دوسری کرسی پہ متمکن ہیں، پشت پر سیکڑوں ماتحت فرشتے قسم قسم کے آلات ضرب لئے ہوئے کھڑے ہیں، سامنے کروڑوں انسان اپنا اپنا نامۂ اعمال لئے ہوئے برہنہ سر، برہنہ پا، گریباں چاک، پریشاں حال، سر سے پاؤں تک پسینے میں غرق، بدحواس منہ کھولے کبھی فرشتوں کو دیکھتے ہیں اور کبھی میزان عدل کو۔)

ایک غیبی مہیب آواز ۔۔۔ "سدا سُکھ حاضر ہے"

(آواز کی ہیبت سے ہر شخص کانوں میں اُنگلی دے لیتا ہے اور تھوڑی دیر بعد مجمع کو چیرتا پھاڑتا ایک معمر انسان پھٹی ہوئی دھوتی اور تار تار کرتے میں نمودار ہوتا ہے، مونچھیں بڑی بڑی، داڑھی منڈی ہوئی، سر صاف لیکن چند بال ایک بڑی چوٹی ۔ پیشانی پر مٹے ہوئے قشقہ کا نشان، بائیں ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ جو سیاہی سے لپا ہوا ہے)

کتبائیل — (بلند غضبناک آواز سے)، ادھر آ، سامنے

(سدا سکھ کانپتا، لرزتا آگے بڑھتا ہے اور سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

کتبائیل — (اور زیادہ کرخت آواز سے) اپنا نام بتا،

سدا سکھ — (کانپتے ہوئے) مجھے سدا سکھ کہتے تھے

کتبائیل — (ہونہہ) تو مسلمان تھا یا ہندو

سدا سکھ — حضور خود جانتے ہیں کہ میں کیا تھا

کتبائیل — (جبیں بہ جبیں ہو کر) مردود، ہم تو جانتے ہی ہیں تو کیا تھا، لیکن ہم تیری زبان سے سننا چاہتے ہیں، خود تجھ سے تیرے کفر کا اعتراف چاہتے ہیں۔ بول،

سدا سکھ — (ہاتھ جوڑ کر) سرکار، تھا تو میں ہندو ہی

کتبائیل — تو کس کی پرستش کرتا تھا،

سدا سکھ — بھگوان کی۔

(لاحول ولا قوۃ کا ایک شور فرشتوں کی صف سے بلند ہوتا ہے اور ان کے گرزوں سے خود بخود چنگاریاں اُڑنے لگتی ہیں)

کتبائیل — یہ کون تھا اور تو اس کی پرستش کیوں کرتا تھا۔

سدا سکھ — یہ خدا تھا، خدا کا ایک نام تھا میری زبان میں

کتبائیل — (طعن آمیز لہجہ میں) خدا کا نام تھا! تیری زبان میں!، ہونہہ۔ کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خدا کے نو دو نہ ناموں میں یہ نام بھی شامل تھا اور کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ سوائے عربی زبان کے کسی اور زبان میں خدا کا نام لینا ناجائز قرار دیدیا گیا تھا۔

سدا سکھ — میں عرب میں پیدا نہ ہوا تھا اس لئے نہ میں عربی زبان سے واقف تھا اور نہ خدا کے "نو دو نہ" ناموں سے میرے مکان کے پاس ایک مسلمان مولوی صاحب رہتے تھے۔ وہ ضرور مجھ کو کبھی کبھی سمجھایا کرتے تھے کہ بھگوان کا نام نہ لیا کرو یہ کفر ہے، "اللہ اللہ" کہا کرو۔

کتبائیل — (حیرت و غصہ سے) اور پھر بھی تو نے کہنا نہ مانا، حد ہے تیرے کفر کی۔ اچھا تو مسلمان مولوی کی اس نصیحت کا کیا جواب دیتا تھا

سدا سکھ — کچھ نہیں، یہی کہ خدا کا کوئی نام نہیں، جس نام سے پکارو وہ سُن لیتا ہے، وہ سب کا مالک ہے، ہندو بھی اسی کے بندے ہیں اور مسلمان بھی، یہ جھگڑے صرف اسی دنیا کے ہیں،

وہاں صرف کام پوچھا جائے گا، نام نہیں۔

(کتبائیل اور کیکائیل ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)

کتبائیل۔ (ہونھ) اچھا اگر تو بھگوان کو خدا ہی سمجھ کر پکارتا تھا تو پھر مندر میں جاکر پتھروں کی پوجا کیوں کرتا تھا، کیا تو انھیں خدا نہ سمجھتا تھا۔

سدا سنگھ۔ میں نے پتھر کی مورتیوں کو خدا سمجھ کر کبھی ان کی پوجا نہیں کی، بلکہ صرف دھیان گیان کے لئے ایک ٹھکانا بنا لیا تھا تاکہ خیال اِدھر اُدھر نہ بٹے۔

کتبائیل۔ کیا مسجد میں جاکر تو دھیان گیان نہ کر سکتا تھا، کیا خدا کی یاد وہاں ممکن نہ تھی؟

سدا سنگھ۔ اُن مولوی صاحب نے بھی مجھ سے ایک دفعہ یہی بات کہی تھی،

کتبائیل۔ پھر تو نے کیا جواب دیا۔

سدا سنگھ۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب اس کے جواب میں میں بھی یہی کہہ سکتا ہوں کہ کیا مندر میں خدا کی یاد نہیں ہو سکتی۔ محراب کے سامنے سجدہ میں گر کے اللہ اللہ کرنا اور مورتیوں کے آگے جھک کر بھگوان نام جپنا ایک ہی ہے۔ میں نے اُن سے یہ بھی پوچھا تھا کہ پتھر کا عبادت کے درمیان میں آجانا ہی بُرا ہے تو پھر آپ لوگ کیوں حج میں حجر اسود کو چومتے ہیں۔ یہ سنکر وہ مرنے مارنے کو طیار ہو گئے اس لئے میں چپ ہو گیا اور اُن سے معافی چاہ لی۔

کتبائیل۔ اللہ ری، تیری دیدہ دلیری کہ تو نے مقدس حجر اسود کا ذکر اپنی ناپاک زبان سے کیا اور اپنی مورتیوں کے ساتھ اس کو ملا دیا۔ خیر معلوم ہو گیا کہ تو ازلی کافر و مشرک ہے اور اس کا خود تو نے اقرار کیا۔ اب یہ بتا کہ تو نے اپنی دنیاوی زندگی کس طرح بسر کی۔

سدا سنگھ۔ صبح پوجا کر کے کھیت پر چلا جاتا تھا، وہاں ہل چلاتا تھا، غلہ بوتا تھا، کاٹتا تھا، اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ محنت کر کے پالتا تھا۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی کو ستایا نہیں سب کے درد دُکھ میں شریک رہا، جو خدمت مجھ سے ہو سکتی تھی اس سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ قرض کبھی کبھی ضرور لیتا تھا لیکن ادا بھی کر دیتا تھا، البتہ ایک قرض ادا نہ ہو سکا میں بیمار تھا اور میری بیوی نے اپنا ایک زیور بیچ کر میرا علاج کیا تھا، میں نے اس سے کہا تھا کہ میں تیرا یہ قرض ضرور ادا کر دوں گا، لیکن افسوس ہے کہ میں اسی بیماری میں مر گیا اور یہ بار میرے سر رہ گیا، اگر وہ معاف کر دے گی تو خیر ورنہ اس کی جو سزا چاہے مجھے دیجائے حاضر ہوں۔

کتبائیل — جو کچھ تو نے بیان کیا اس کا کیا ثبوت ہے۔
سدا سکھ — ساری دنیا سامنے موجود ہے، آپ خود پوچھ لیجئے کہ کسی کو مجھ سے کوئی شکایت ہو یا نہیں
(ایک خارا شگاف آواز بلند ہوتی ہے کہ "سدا سکھ کے خلاف جس کو جو کچھ کہنا ہے سامنے آئے"۔ دیر تک اس کی گونج قایم رہتی ہے اور پھر اس کو دہرایا جاتا ہے، لیکن کوئی شخص سامنے نہیں آتا)

کتبائیل — (کافی انتظار کے بعد) اپنا نامۂ اعمال کھول اور پڑھ اس میں کیا لکھا ہے۔
سدا سکھ — (نامۂ اعمال کھولکر غور سے دیکھتے ہوئے) یہ تو بالکل سیاہ ہے اور سوائے کفر و شرک کے اور کچھ اس میں نظر ہی نہیں آتا۔
کتبائیل — (ماتحت فرشتوں سے خطاب کرکے) لیجاؤ اس کو میزان عدل کی طرف۔
(چند فرشتے آتے ہیں اور دھکا دیتے ہوئے اسے کیکائیل کی طرف لیجاتے ہیں)

(۳)

(وہی منظر، وہی مقام اور وہی وقت)

غیبی آواز — ضرغام الدین حاضر ہے۔

(ضرغام الدین - ادھیڑ عمر کے آدمی - لمبی داڑھی - مونچھ منڈی ہوئی - پیشانی پر چمکتا ہوا نشان سجدہ کا - بائیں ہاتھ میں جریب، داہنے میں نامۂ اعمال لئے ہوئے نمودار ہوتے ہیں)

کتبائیل — "تمہارا کیا نام ہے"

(مجمع میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے اور متعدد مرد عورت لوگوں کو چیرتے پھاڑتے سامنے آتے ہیں)

سب — (ایک آواز سے) انصاف، انصاف،
کتبائیل — ہائیں، یہ کیا ہنگامہ ہے، تم لوگ کیا چاہتے ہو،
سب — (ایک آواز سے) ہم انصاف چاہتے ہیں اور ضرغام الدین کے خلاف۔
کتبائیل — (تعجب سے) ضرغام الدین۔ مولوی ضرغام الدین کے خلاف۔ وہ شخص جس نے کبھی ایک وقت کی نماز قضا نہیں کی، جس نے کبھی ایک روزہ ترک نہیں کیا، جس نے اپنی عمر میں پچیس حج کئے اور ہر سال متعدد قربانیاں کیں

ب — "ہاں، ہاں اسی کے خلاف

کتبائیل — اچھا، تو ہر شخص علٰحدہ علٰحدہ کہے جو اسے کہنا ہے۔

(ایک عورت آگے بڑھتی ہے)

عورت — میرا نام طاہرہ ہے، میرا باپ ضرغام الدین کا مُرید تھا اور خاصہ دولتمند آدمی تھا، میں اسکی اکلوتی بیٹی تھی، میرے باپ کو یہ ہر سال اپنے ساتھ حج چلنے کی ترغیب دیا کرتا تھا، لیکن وہ کسی نہ کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ جاسکتا تھا۔ جب وہ بہت ضعیف ہوگیا تو اس خیال سے کہ معلوم نہیں آیندہ سال تک جیوں یا مروں، اس نے اس مولوی سے کہا کہ "میں امسال آپ کے ساتھ جانے کے لئے طیار ہوں" اس نے سوچکر کہا کہ "میں تو اس مرتبہ تمھارا ساتھ نہ دے سکوں گا کیونکہ میں نے رات کو خواب دیکھا ہے کہ آنحضرت سرورِ کائنات تخت پر تشریف فرما ہیں اور فرماتے ہیں کہ نور محمد کو میرے پاس بھیجدو۔ میں نے عرض کیا حضور مجھے بھی حاضری کی اجازت ہو، ارشاد ہوا کہ نہیں تم وہیں رہو اور نور محمد کے گھر کی حفاظت کرو" سو بھئی میرا جانا تو ناممکن ہے اور تمھارا ٹھہرنا کسی طرح درست نہیں۔ میرے باپ نہایت جاہل سیدھے شخص تھے وہ یہ خواب سنکر مسرت سے اُچھل پڑے اور اسی دن سے اپنے جانے کی طیاریاں شروع کردیں۔ چونکہ میری ماں کا کئی ہزار کا زیور موجود تھا اور گھر میں کوئی دوسرا محافظ نہ تھا اس لئے وہ چلتے وقت زیور اور مجھے دونوں کو اس مولوی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں واپس نہ آسکوں تو میری بیٹی کو دیدیا جائے۔

(کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی اور سارے مجمع کی نگاہیں ضرغام الدین پر پڑنے لگیں جو خاموش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے)

کتبائیل — "پھر کیا ہوا"

طاہرہ — جب میرا باپ حج کے بعد واپس نہ آیا تو مجھے فکر ہوئی کہ کیا بات ہے، ضرغام الدین سے کئی بار پوچھا اس نے یہ کہکر ٹالدیا کہ آتا ہوگا، آخر کار میرے محلہ کا ایک آدمی کچھ عرصہ کے بعد واپس آیا اور میرے باپ کے دو خط لایا ایک میرے نام کا اور دوسرا ضرغام الدین کے نام۔ میرے خط میں لکھا تھا کہ میں بیس دن سے بیمار ہوں اور مجھ میں کوئی حالت باقی نہیں رہی اگر یہ خط تمھیں ملے تو سمجھ لینا کہ میں مرگیا اور اپنا زیور پیر صاحب سے لیکر کسی مناسب جگہ جہاں تم پسند کرو شادی کرلینا۔ اپنے پیر کو بھی اس نے یہی لکھا تھا کہ زیور میری لڑکی کو دیدیا جائے

کتبائیل — (بات کاٹ کر) پھر زیور تجھے ملا یا نہیں

طاہرہ — اسی سے پوچھئے کہ وہ کس شرط پر زیور دینا چاہتا تھا۔

کتبائیل — کیا شرط تھی۔

طاہرہ — کہتا تھا کہ میرے ساتھ شادی کر لو

کتبائیل — پھر تو نے شادی کی یا نہیں

طاہرہ — نہیں

کتبائیل — کیوں

طاہرہ — مجھے اس کی صورت پسند نہ تھی، اس کی سیرت سے نفرت تھی، میں جانتی تھی کہ اس کے گھر میں اسکی بیوی موجود ہے اور یہ کس کس طرح اس کو تکلیفیں پہونچاتا ہے، میں سمجھتی تھی کہ صرف زیور کی وجہ سے میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد وہ گھر سے نکال دیگا پھر سو بات کی ایک بات یہ کہ یہ بڈھا کھوسٹ تھا اور میری عمر زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی

کتبائیل — "پھر کیا ہوا"

طاہرہ — یہ ہوا کہ اس نے زیور دینے سے انکار کر دیا اور میں اس صدمہ سے بیمار ہو کر دق میں مبتلا ہو گئی اور اپنے باپ کے مرنے کے چھ مہینے بعد ہی اس مولوی کو دعائیں دیتی ہوئی دُنیا سے رخصت ہو گئی۔

کتبائیل — (ضرغام الدین سے) کیوں کیا کہتے ہو۔ کیا اس عورت کا بیان صحیح ہے۔

(ضرغام الدین خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا)

کتبائیل — کوئی فریادی اور ہے؟

ایک نوجوان — (آگے بڑھکر) حضور، میں بھی ایک فریاد لایا ہوں۔

کتبائیل — کہو کیا کہتے ہو

نوجوان — میرا نام حسیب الدین ہے، میں ہندوستان کی خلافت کمیٹی کا سکرٹری تھا اور مولانا ضرغام الدین کمیٹی کی طرف سے دورہ کرنے برما بھیجے گئے تھے وہاں ان کو سیٹھ جمال نے دس ہزار روپیہ کے دس نوٹ دئے لیکن انھوں نے واپس آکر داخل نہیں کئے اور نہایت افسوسناک لہجہ میں بیان کیا کہ رنگون میں کسی نے جیب سے نکال لئے۔ میں نے سیٹھ جمال سے نوٹوں کے نمبر منگوائے اور خفیہ جانچ کی تو معلوم ہوا کہ اس شخص نے وہ تمام

نوٹ ایک ایک کرکے اپنے وطن میں بھنائے اور ایک پختہ مکان اسی رقم سے طیار کرایا چنانچہ میں درخواست کرتا ہوں کہ اس سے خیانت کا مواخذہ کیا جائے اور جو حویلی اس نے طیار کی تھی اس کے گلے میں ڈالدیجائے تاکہ اس کے بوجھ سے یہ ہر وقت پستا اور کراہتا رہے۔

کتبائیل — (خاموش) سزا کی تجویز کسی بندہ کا کام نہیں، اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسکو چاہتا ہے معاف کردیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا نہیں کرتا۔ (بلند آواز سے) اور کسی کو کچھ کہنا ہے۔

ایک عورت — (آگے بڑھکر) مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔

کتبائیل — بول، کیا کہتی ہے۔

عورت — میرا نام بلقیس ہے، میرا شوہر اس کا مرید تھا اور فرشتہ سے کم معصوم اسے نہ سمجھتا تھا۔

کتبائیل — (فرشتہ کے ساتھ معصومیت کی نسبت سنکر کن انکھیوں سے کیکائیل کی طرف دیکھتے ہوئے) توکیا یہ فرشتوں کی طرح معصوم نہ نکلا۔

عورت — فرشتوں کی معصومیت کا حال تو مجھے دنیا میں بھی معلوم نہ تھا اور یہاں بھی اس کا کوئی تجربہ ابھی تک نہیں ہوا۔

پہلے آپ میری پوری بات سُن لیجئے، پھر خود فیصلہ کیجئے گا کہ وہ آپ سے زیادہ معصوم تھا یا آپ اس سے زیادہ معصوم ہیں۔

کتبائیل — (خشونت کے ساتھ) جلدی کہہ جو کچھ کہنا ہے۔

عورت — مجھے اطمینان سے کہنے دیجئے، غصہ نہ کیجئے، فرشتوں کے پیارے چہروں کے لئے یہ چیز موزوں نہیں۔ ہاں، تو اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ "چلو تمھیں بھی پیر صاحب کے پاس لے چلوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کیا اس کو مرید نہ کراؤ گے"۔ میں محلہ کی عورتوں سے پیر صاحب کا سارا حال سُن چکی تھی اس لئے دل نہ چاہتا تھا، لیکن اپنے شوہر کے اصرار سے مجبور ہوگئی۔ آخر کار ایک دن بعد نماز عشاء وہ مجھے لے گئے اور حجرہ کے اندر چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ پیر صاحب لیٹے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی "سبحان اللہ سبحان اللہ" کی تسبیح پڑھنے لگے اور بولے تیرا کیا نام ہے۔

شرم کے مارے میں پسینے پسینے ہوئی جاتی تھی اور سمٹی ہوئی پیچھے سرکتی جارہی تھی،

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پھر پوچھا اور ذرا سخت لہجہ میں میں نے بادلِ نخواست
نام بتایا، وہ اُٹھ بیٹھے اور اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا کہ ہاتھ باہر نکال، میں آج تجھے اپنے حلقہ
میں داخل کرتا ہوں۔ میرا شرم کے مارے بُرا حال تھا کیونکہ اسی دن میں نے مہندی
لگائی تھی اور اس کی سرخی چڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن ادھر سے پھر اصرار ہوا اور مجبوراً
اپنا کا پنتا ہوا ہاتھ میں نے آگے بڑھا دیا۔ انھوں نے میرے ہاتھ کو فوراً دبوچ لیا اور
کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے جاتے تھے اور میرا ہاتھ مسلتے جاتے تھے، ہاتھ مسلتے جاتے
تھے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں، سر جھکا لیا او
غیرت و شرم سے مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

آدھ گھنٹہ کے بعد جب میرے ہاتھ کی حالت بالکل نچوڑے ہوئے کپڑے کی طرح ہوگئی
تو اسے چھوڑ دیا اور میری گردن کی طرف ہاتھ بڑھا کر دونوں شانے پکڑ لئے، میں نے چاہا کہ
اُٹھکر بھاگ جاؤں لیکن اول تو وہ گرفت ایسی نہ تھی کہ میں آسانی سے پیچھا چھڑا لیتی اور
دوسرے یہ کہ جاتی بھی تو کہاں، آگے یہ شیطان تھا اور پیچھے دیوار، حجرہ کا دروازہ بند تھ
اور میرے احمق شوہر مجھ سے دور گھر میں بیٹھے "دعائے گنج العرش" پڑھ رہے تھے۔
میں نے مجبوراً اسے بھی برداشت کیا لیکن جب اس کے ہاتھ شانے سے ہٹکر نیچے سینہ کی طر
پہونچنے لگے تو مجھ سے ضبط نہ ہوا اور میں کھڑی ہوگئی اور جتنی گالیاں میں دے سکتی تھی سب
سُنا دیں۔

جب گھر واپس آئی تو میرا بُرا حال تھا اور میرے شوہر ہنوز وظیفہ میں مصروف تھے۔ میں نے
پہلے تو ارادہ کیا کہ سارا حال کہدوں لیکن یہ سمجھ کر کہ اسے کبھی یقین نہ آئے گا، خاموش ہو گ
اور پھر کبھی نہیں گئی۔ اس کو میرے شوہر نے انتہائی گستاخی سمجھ کر مجھے بُرا بھلا بھی کہا، اور
مارا بھی لیکن میں نے اس طرف کا رخ پھر کبھی نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ میرے اور شوہر کے
درمیان مغایرت بڑھتے بڑھتے نفرت میں تبدیل ہوگئی اور آخر کار ایک دن اس نے اسی
شیطان کے کہنے سے مجھے طلاق دیدی اور میری معصوم بچی مجھ سے چھین کر مجھے باہر نکال دیا
میرے ماں باپ غریب تھے وہ بھی صبر کر کے بیٹھ رہے اور میں اپنی بچی کو یاد کرتے کرتے
ایک سال کے اندر ہی ختم ہوگئی۔

کتبائیل — (ضرغام الدین سے مخاطب ہو کر) کیوں تمہارا کیا جواب ہے۔

(ضرغام الدین بدستور خاموش رہا)

کتبائیل — (بلند آواز سے) کوئی اور فریادی؟

(دفعتہً متعدد آدمی آگے بڑھنے لگے اور یہ کشمکش خطرناک صورت اختیار کرنے لگی)

کتبائیل — (یہ ہنگامہ دیکھ کر) اچھا، اب میں کسی کی فریاد سننا نہیں چاہتا، کیونکہ نجات کا تعلق ان باتوں سے نہیں ہے بلکہ صرف معتقدات سے ہے اور اس لئے میں سب سے پہلے اس مسئلہ کو طے کرنا چاہتا ہوں۔ (ضرغام الدین سے)۔ بولو تمھارا مذہب کیا تھا۔

ضرغام الدین۔ "اسلام"

کتبائیل — تم خدا کو ایک سمجھتے تھے۔

ضرغام — ایک بالکل ایک — وحدہٗ لاشریک لہٗ

کتبائیل — انبیاء ورسُل کے قایل تھے

ضرغام — ایسا قایل کہ بغیر ان کا نام لئے ہوئے کوئی کام نہ کرتا تھا،

کتبائیل — تم کتب سماوی، حیات بعد الموت، عذاب قبر، منکر نکیر، برزخ، حشر ونشر، دوزخ وجنت کو برحق جانتے تھے۔

ضرغام — برحق نہ جانتا تو آج باوجود اتنی سیاہ کاریوں کے نجات کی طرف سے مطمئن کیونکر ہو سکتا تھا۔

کتبائیل — تم کو اس میں کوئی شک تو نہ تھا کہ حوّا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں اور شیطان کے دھوکے میں آکر انھوں نے گیہوں کھایا اور جنت سے نکالے گئے۔

ضرغام — شک کیسا؟ میں نے تو اپنی ساری زندگی اسی افسوس میں بسر کر دی کہ اگر آدم وحوّا سے یہ غلطی نہ ہوتی تو عدن میں چین سے پڑے پڑے ہر وقت میوے نہ کھایا کرتے۔

کتبائیل — کیا تم، نبی آخر الزماں کے معجزۂ شق القمر کو تسلیم نہ کرتے تھے

ضرغام — نبی آخر الزماں تو خیر رسول خدا تھے میں تو امت محمدی کے ہر ہر ولی کو صاحب کشف وکرامات جانتا تھا اور دور کیوں جائیے خود مجھ سے بھی بعض کرامتیں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

کتبائیل — طوفان نوح، کے بابت تمھارا کیا عقیدہ تھا

ضرغام — یہی کہ وہ ایک بڑھیا کے تنور سے اُٹھا اور سوائے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کے سب کو ڈبو دیا۔

کتبائیل — حضرت موسیٰ نے جب مصر کے جادوگروں کے سامنے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو کیا ہوا!

ضرغام — وہ اژدہا بنکر جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا

کتبائیل — اور جب انھوں نے دریائے نیل پر عصا مارا تو ——"

ضرغام — (جلدی سے بات کاٹ کر) دریا پھٹ گیا، بنی اسرائیل آسانی سے گزر گئے لیکن فرعون جب گزرنے لگا تو پانی کے دھارے پھر مل گئے اور وہ اپنے لشکر سمیت غرق ہو گیا۔

کتبائیل — حوران بہشت کے متعلق تمہارا یہ عقیدہ تھا کہ وہ صرف خیالی چیزیں ہیں اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

ضرغام — استغفراللہ، میں نے عبادتیں ہی اس لئے کی تھیں کہ یہاں حوریں ملیں گی، میں تو انسے ملنے کی امید پر خدا جانے کتنے چلے دریا میں ننگے کھڑے ہو کر کھینچ چکا ہوں اور آپ پوچھتے ہیں کہ میں انھیں خیالی چیز تو نہیں سمجھتا تھا، خوب!

کتبائیل — کیا تمھیں یقین نہ تھا کہ بھلائی برائی سب خدا کی طرف سے ہے۔

ضرغام — یہ یقین نہ ہوتا تو دنیا میں اتنے گناہ کرنے کی جرأت ہی کیونکر ہوتی۔

کتبائیل — اس کا کیا مطلب!

ضرغام — یعنی میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ سب خدا کی مرضی سے ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کرنے پر میں قادر نہیں

کتبائیل — اور ہاں ہم فرشتوں کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ تھا۔

ضرغام — میں آپ لوگوں کو نورانی مخلوق سمجھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ آپ جو صورت چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، نظام کائنات سب آپ ہی حضرات کے ذریعہ سے ہوتا تھا اور آپ میں سے ہر ایک کسی خاص خدمت پر مامور تھا، میں آپ کو معصوم بھی سمجھتا تھا یعنی یہ کہ آپ نہ مرد ہیں نہ عورت۔

کتبائیل — معتقدات کے لحاظ سے تمہارے جواب واقعی ایسے ہیں کہ تمہارے گناہوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی، تاہم چونکہ جزا و سزا کی تعیین میرا فرض نہیں ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ فیصلۂ خداوندی تمہارے حق میں کیا ہو اس لئے تم جاؤ پہلے میزان میں اپنا نامۂ اعمال وزن کراؤ اور وہاں سے پل صراط پر جاؤ کہ آخری فیصلہ وہیں ہوتا ہے۔

(مولانا ضرغام میزان عدل کی طرف اکڑتے ہوئے بڑھتے ہیں)

---

(۳)

[وہی وقت، وہی منظر، میزان عدل کے پاس سداسکھ اور مولانا ضرغام
دونوں اپنا اپنا نامۂ اعمال لئے کھڑے ہیں۔]

کیکائیل — (بھاری آواز سے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے) تم اپنے اپنے اعمال علٰحدہ علٰحدہ وزن کرانا چاہتے ہو یا ایک ساتھ۔

ضرغام — میں اس کا مطلب نہیں سمجھا

سداسکھ — میں بھی نہیں سمجھا

کیکائیل — یعنی ایک صورت تو وزنِ اعمال کی یہ ہے کہ ہر شخص کا نامۂ اعمال الگ الگ میزان میں رکھ کر دیکھا جائے کہ پلڑا جھکتا ہے یا اوپر اُٹھتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک پلڑے میں ایک کا نامۂ اعمال رکھا جائے اور دوسرے میں دوسرے کا اور پھر دیکھا جائے کہ کون جُھک جاتا ہے۔

ضرغام — (ذرا تن کر) یہ آپ نے کیا فرمایا، کجا یہ کافر، کجا میں مردِ مسلمان، میرے اعمال سے اسکے اعمال کو کیا نسبت،

سداسکھ — سچ ہے، میرے اعمال سے ان کے اعمال کو نسبت،

کیکائیل — لیکن مناسب یہی ہے کہ دونوں ایک ساتھ رکھ کر تول لئے جائیں، کیونکہ اس طرح سب کو معلوم ہو جائے گا کہ کفر و اسلام میں کیا فرق ہے۔

ضرغام — (مسکراتے ہوئے) بالکل درست فرمایا آپ نے ایسی صورت بہتر ہوگی

کیکائیل، فرشتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان میں سے دو فرشتے دونوں کا فردِ اعمال لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ایک فرشتہ مولنٰنا ضرغام کے سامنے جاکر اپنے ہاتھ مودبانہ پھیلا دیتا ہے اور وہ اپنا نامۂ اعمال اس پر انتہائی تبختر کے ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ دوسرا فرشتہ سداسکھ کے قریب جاتا ہے پہلے اسکی طرف گھورتا ہے اور پھر انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ ایک خنجر کی نوک اس کے نامۂ اعمال میں چبھو کر اُٹھا لیتا ہے اور ہاتھ کو جسم سے دور رکھے ہوئے اس طرح لیجاتا ہے گویا وہ کوئی سخت نجس چیز ہے۔

دونوں فرشتے میزان کی طرف جاتے ہیں اور داہنے پلڑے میں مولانا ضرغام کی فردِ عمل رکھ دیتے ہیں اور بائیں میں سدا سنگھ کی۔ دفعۃً بایاں پلڑا اوپر اٹھنا شروع ہوتا ہے اور داہنا جھکنا۔ یہاں تک کہ مولانا ضرغام کے اعمالِ حسنہ کے وزن سے زمین چرچرانے لگتی ہے اور "سبحان اللہ" کا نعرہ فرشتوں کی صف سے بلند ہوتا ہے۔

(۴)

میدانِ حشر کا وہ حصہ جس کے آگے دوزخ و جنت کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ سامنے پُل صراط قائم ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے، اس کے نیچے نہایت عمیق و وسیع غاروں کا سلسلہ ہے جن سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور ماورائے پُل صراط حدِ نظر نخلستانوں کے آثار نظر آ رہے ہیں جہاں سے فردوس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میدان کے ایک گوشہ میں بہت سے جانور کھڑے ہوئے ہیں، جن میں زیادہ تر دُنبے، بھیڑیں اور بکریاں ہیں، اونٹ بھی نظر آتے ہیں لیکن کم ——— ہجوم سے مولانا ضرغام اور سدا سنگھ نکل کر سامنے آتے ہیں۔

ایک فرشتہ — (ان سے مخاطب ہو کر) تم دونوں کا حساب و کتاب ہو چکا، میزانِ عدل میں فردِ عمل تُل چکی اور کارکنانِ قدرت کی طرف سے جو اطلاع عرشِ کبریائی تک پہونچائی جانی تھی وہ پہونچا دی گئی، اب وقت فیصلہ کا ہے جو صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تم دونوں میں سے کس کو مستحقِ نجات قرار دیتا ہے اور کس کو لائقِ سزا، وہ مالک و مختار ہے اور اس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا کہ جزا و سزا کے اصول اس نے کیا مقرر فرمائے ہیں۔ بہر حال یہ سامنے پُل صراط ہے اب تم آگے بڑھو اور اس سے محفوظ گزر جانے کی کوشش کرو، اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو سبحان اللہ کیا کہنا وہ سامنے بہشت ہے اور اس کی تمام ناقابلِ قیاس لذتیں، اگر تم ناکام رہے تو کہنے کی ضرورت نہیں، آگ کے شعلے غاروں سے بلند ہوتے ہوئے تمھیں بھی نظر آ رہے ہوں گے۔

سدا سنگھ — (کانپتا، لرزتا ہوا) اگر نجات کا انحصار اسی پُل صراط سے گزر جانے پر ہے اور بہشت ان مہیب غاروں کو عبور کرنے کے بعد ہی مل سکتی ہے تو میں درخواست کروں گا کہ

مجھے یہیں سے اُٹھا کر آپ جہنم میں ڈال دیجئے، کیونکہ پُل صراط سے گزرنا کسی کے امکان میں نہیں ہے خاصکر میں کہ دنیا میں ایک دن بھی میں نے جمناسٹک کی مشق نہیں کی نہ تار اور رسّی پر چلنا سیکھا۔

فرشتہ۔ (غصہ سے) بدتمیز کافر خاموش رہ تجھے کیا خبر کہ مسلمانوں کے لئے یہی پُل صراط ایک وسیع سڑک بن جاتی ہے اور وہ کس شان کے ساتھ اس سے محفوظ گزر جاتے ہیں۔ (ضرغام الدین سے مخاطب ہوکر) بولو تم کیا کہتے ہو۔

ضرغام الدین۔ بیشک درست فرمایا آپ نے، دیکھئے میں ابھی اس کو عبور کرکے دکھاتا ہوں۔ (جانوروں کی طرف منھ کرکے) اے میری قربانی کے جانورو، چلو آگے بڑھو اور مجھے پُل صراط پر لے چلو کہ اسی دن کے لئے میں نے تمہارا خون بہا کر تم پر احسان کیا تھا۔

جانوروں کے جھنڈ سے درجنوں، دُنبے اور بکرے دوڑتے ہوئے ضرغام الدین کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ ان میں سے ایک نہایت موٹے تازے دُنبے کا انتخاب کرکے اس پر سوار ہو جاتا ہے اور پُل صراط کی طرف چل پڑتا ہے۔ سدا سُکھ حیران و پریشان اس منظر کو دیکھ رہا ہے اپنی بے بسی و بیکسی پر آنسو بہا رہا ہے۔ دفعتہً ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے اور کشاں کشاں اسے پُل صراط کی طرف لیجاتا ہے۔ ناگہاں نہایت تیز چمک کے ساتھ تڑاتے کی آواز پیدا ہوتی ہے اور سب کی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ مولانا ضرغام بجلی کی رفتار سے پُل صراط کو عبور کرتے چلے جاتے ہیں اور سدا سُکھ کا جسم ہر قدم پر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر پُل صراط سے نیچے غاروں کے اندر گر رہا ہے۔

ضرورت ہے

۲۲ء فروری تا جون۔ اگست و نومبر ۲۳ء مارچ اپریل اگست و دسمبر ۲۴ء ستمبر ۲۵ء جنوری۔ اگست اکتوبر، نومبر و دسمبر ۲۶ء مارچ تا مئی، ستمبر تا دسمبر ۲۷ء فروری۔ جولائی تا دسمبر ۲۸ء جنوری، فروری۔ اپریل تا جولائی۔ ستمبر تا دسمبر ۳۰ء جنوری، اپریل تا جولائی۔ دسمبر ۳۱ء جنوری، اپریل و مئی۔ ۳۲ء اپریل — ۳۳ء جون۔ اگست و دسمبر ۳۴ء جنوری، فروری، اگست و نومبر ۳۵ء اکتوبر۔

مینیجر نگار

یو-پی کا ایک نوجوان ہندو شاعر

"فراق" گورکھپوری

ایک زمانہ تھا کہ میری زندگی کی تنہائیوں کا دلچسپ ترین مشغلہ صرف شعر پڑھنا تھا، اس کے بعد شعر کہنے کا دور آیا اور کافی عرصہ تک مجھ پر مسلط رہا، لیکن ان دونوں زمانوں میں کوئی زمانہ اس احساس سے خالی نہ گزرا کہ اگر شاعری ہماری حیاتِ دنیاوی کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری نہیں ہے تو کم از کم اسے ایک نوع کی وجدانی تسکین کا ذریعہ یقیناً ہونا چاہئے ۔ اور اگر یہ بات بھی اسے حاصل نہ ہو تو پھر

"ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ ۔

یہ تھا وہ احساس جو شاعری ترک کرا کے آہستہ آہستہ مجھے "انتقادِ شاعری" کی طرف لے گیا، اور اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ آج اکثر حضرات خیال کرتے ہیں کہ شاید میں اپنے سوا کسی کو شاعر سمجھتا ہی نہیں، حالانکہ حقیقت اسکے بالکل برعکس یہ ہے کہ میں سوائے اپنے ساری دنیا کو شاعر سمجھنے کے لئے طیار ہوں بشرطیکہ میں دنیا کی شاعری میں وہ چیز نہ پاؤں جس نے مجھ سے میری شاعری ترک کرائی۔

میں شاعری میں کیا چاہتا ہوں؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے اور اگر اسے شاعری نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ میں اس میں "وہ کچھ چاہتا ہوں جسے میں بتا نہیں سکتا"

شاعری "دل کا معاملہ" ہے اور دنیا میں اتنے مختلف "دل" اور ان کے اتنے مختلف جذبات ہیں کہ اس کے متعلق کوئی نظریہ "مسلمات" کی حیثیت سے پیش کرنا تو ممکن نہیں، لیکن اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے اور اس کے بعد پھر یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے چہ جائیکہ "اخلاقیات" و "مذہبیات" وغیرہ کی بحث چھیڑنا کہ اسے تو شاید کوئی پیغمبر بھی گوارا نہ کرے اگر وہ شعر کہنے پر آجائے۔

بعض کا خیال ہے کہ شاعری اور آرٹ دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں ۔ میں یہاں آرٹ اور اس کی

ہمہ گیری کے متعلق اظہار خیال کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اسقدر عرض کرنا ضروری ہے کہ آرٹ تو خیر بہت لطیف چیز ہے شاعری، "مادیات" سے بھی جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ انسان کے لطیف ترین "نہ ائید ہائے خیال" وہ ہیں جو اس نے فلسفۂ حیات و فلسفۂ مذہب کے متعلق پیش کئے ہیں علی الخصوص ہندو مذہب اور ہندو فلسفۂ حیات۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا میں "بت پرستی" رواج پا کر رہی اور خدا کا تصور بغیر "عرش و کرسی" کے ذکر کے ممکن نہ ہوا۔ شاید یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس کو غالب نے یوں ظاہر کیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

سو دیکھنے کی چیز یہی ہے کہ "دشنہ و خنجر" کے الفاظ سے واقعی "ناز و غمزہ" کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یا نہیں اور اسی کا نام شاعری ہے جسے اگر "آرٹ" سے علحدہ کر دیا جائے تو اس کے "تصوف" ہو جانے میں تو شک ہی نہیں اگر بدقسمتی سے وہ "مجذوب کی بڑ" کا مرتبہ نہ پا سکی۔

الغرض شاعری کی اصل روح چاہے کچھ ہو لیکن اس روح کو ہم جس جسم کے اندر دیکھتے ہیں وہ میری رائے میں صرف الفاظ کا "رکھ رکھاؤ" ہے۔ یہاں اس منطقی بحث کی ضرورت نہیں کہ جس چیز کا نام "رکھ رکھاؤ" ہے وہ خود الفاظ سے علحدہ ایک چیز ہے اور اسی لئے جب میں کسی شاعر کے کلام پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا ہے اور وہ ذہن سامع تک ان کو پہونچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں بیان خواہ حسن و عشق کا ہو یا "نہر کی پن چکی" کا اس سے غرض نہیں، دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اور پھر چونکہ میں اسی دنیا کا آدمی ہوں جہاں الفاظ کا "شرمندۂ معنی" ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس دنیا کے علاوہ میں کسی اور ایسی دنیا کا قایل نہیں ہوں جہاں "معنی"، "شرمندۂ الفاظ" نہیں ہوتے، اس لئے میں یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم شاعری اسی "پُر معصیت" دنیا کی کی جائے کیونکہ "معصومیت" کا تصور محض "لڑکپن" ہے اور شعر نام ہے "جوانی" کا۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک دوست ہیں جو کسی وقت شعر کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے، لیکن اب تصوف کی طرف مایل ہو گئے ہیں اور مجھ سے بہت خفا رہتے ہیں، کیونکہ میرے نزدیک شاعری کو تصوف سے متعلق کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی خوبصورت عورت سے شادی کر لی جائے کہ اس کے بعد "حسن و عشق" دونوں کا "وحدہ فنایا" ہے، نہ عورت عورت رہجاتی ہے، نہ مرد مرد۔

ایک دن فرمانے لگے کہ "تم نہیں سمجھ سکتے تصوف اور اس کی شاعری کتنی بلند چیز ہے"۔ اسکی ابتدائی منزل "ترکِ دنیا" ہے اور پھر "ترکِ عقبیٰ" و "ترکِ مولیٰ" سے گزر کر "ترکِ ترک" کے مرتبہ تک پہونچ جاتی ہے۔ تمہاری شاعری تو "ترکِ دنیا" سے بھی نیچے ہے اور تصوف کی شاعری کی ابتدا "ترکِ ترک" سے ہوتی جہاں "خیالِ ترک" بھی ترک کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ "دلِ بے مدعا" جس پر شاعر نے ہمیشہ سر دھنا لیکن پایا نہیں اور صوفی شاعر نے اسے پہلے ہی قدم پر پالیا۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک شاعری کی ایک منزل اور اس سے بھی بلند ہے پوچھا "وہ کیا" میں نے کہا کہ نام تو اس کا مجھے معلوم نہیں لیکن نمونے ایک دو ضرور پیش کر سکتا ہوں مثلاً:-

ٹوٹی دریا کی کلائی زلف اُلجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں

فرمانے لگے "یہ تو بالکل مہمل ہیں" میں نے کہا کہ آپ کا "ترکِ ترک" اس سے زیادہ مہمل ہے اس رنگ کے شاعر کو ہم زیادہ سے زیادہ مسخرا کہہ سکتے ہیں، لیکن آپ کی اس "ترکیات" والی شاعری کو تو سوائے حماقت کے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ رہ گیا دلِ بے مدعا سو حضرت وہ آپ ہی کو مبارک رہے، مجھے تو ایسا دل دیجئے جس میں سوائے مدعا کے کچھ نہ ہو اور اسی کیساتھ کسی معشوقہ پری تمثال کو سامنے بٹھا کر چلے جائیے پھر دیکھئے کہ "وصل وصل" کا رنگ زیادہ چوکھا رہتا ہے یا "ترکِ ترک" کا۔ اس میں شک نہیں کہ "ذہن رسا" فطرت کی بڑی پاکیزہ ودیعت ہے جو انسان کو عطا ہوئی ہے، لیکن اگر اسمیں بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو پھر انسان انسان تو رہتا نہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ صوفی ہو جائے یا اس سے بھی بڑھکر خدا بن بیٹھے۔

ایک صاحب نے مجھ پر اعتراض کیا کہ باوصف تصوف سے اسقدر بیگانہ ہونے کے میں بیدل کی شاعری کا کیوں دلدادہ ہوں جو کہ سر تصوف ہے۔ میں خاموش رہا کیونکہ ان کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ بیدل کی شاعری تو ایک خاص قسم کی شاعری ہے اور اسی لئے جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کے لئے الفاظ وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ یا تو وہ خود ہیں اس فضا میں لیجاتے ہیں جہاں کے وہ الفاظ ہیں یا پھر خود اس فضا میں آکر ہمارے ذہن کو متاثر کرتے ہیں جہاں کی باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں۔ مجاز کو بیدھڑک "حقیقت" کہدینا اتنا مرغوب نہیں۔ جتنا "حقیقت" کو بھی مجاز کے رنگ میں ظاہر کرنا۔

سو یہ بالکل غلط ہے کہ میں تصوف کے رنگ سے متنفر ہوں، یہ ضرور ہے کہ شاعری کا خون تصوف کے ہاتھ سے مجھے پسند نہیں۔ اور میرا ہر شاعر سے خواہ وہ کسی رنگ کا ہو صرف یہ مطالبہ ہے کہ وہ جو خیال

چاہے ظاہر کرے لیکن یہ دیکھے گے کہ اس کے الفاظ سے وہ پوری طرح ادا بھی ہوتا ہے یا نہیں، اسکے بعد مرتبہ اسلوب بیان کا ہے جس کی بلندی و نزاکت کے لحاظ سے شعر اُن خصوصیات کی حدود میں آتا ہے جو ہم کو اس بات کے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ یہ شعر میر کا ہے یا سودا کا، مومن کا ہے یا غالب کا، اور جن سے ہم شعر کے خوب اور خوب تر ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں۔

دورِ حاضر اس میں شک نہیں کہ ترقی سخن کا دور ہے اور مغربی تعلیم نے ذہنیت انسانی کو اتنا وسیع و بلند کر دیا ہے کہ ہم کو ہر جگہ اچھے اچھے سخنگو نظر آرہے ہیں، لیکن اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے شاندار مستقبل کا پتہ ان کے حال سے چلتا ہے تو یہ فہرست بہت مختصر ہو جائے گی۔ اتنی مختصر کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں بلا تامل ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر دوں تو میری زبان سے فوراً فراق گورکھپوری کا نام نکل جائے گا۔

فراق جن کا نام رگھوپتی سہائے ہے گورکھپور کے رہنے والے ہیں اور ہر چند اُردو شاعری کا ذوق انھیں وراثتاً ملا ہے لیکن ان کا مخصوص "رنگِ سخن" خود انھیں کی ذاتی چیز ہے، جس کے ابتدائی نشو و نما یا تدریجی ارتقاء پر میں کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا، کیونکہ میں ان کے ابتدائی حالات سے بالکل ناواقف ہوں میں نے اول اول اُن کو یہیں لکھنؤ میں دیکھا تھا جبکہ وہ گریجویٹ ہو چکے تھے، اس کے بعد کانپور کے سناتن دھرم کالج سے تعلق پیدا کر لیا اور وہیں سے وہ انگریزی ادب میں ام۔ اے کی سند حاصل کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی چلے گئے جہاں اب بھی وہ زبان انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

لکھنؤ کی متعدد ملاقاتوں میں، میں نے یہ اندازہ تو کر لیا تھا کہ یہ شخص غیر معمولی ذہین (GENIUS) ہے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس کا ایک قدم نہایت مضبوط پتھر پر قائم ہے اور دوسرا ایسی متزلزل چٹان پر کہ ذرا سا اشارہ گرا دینے کے لئے کافی ہے، لیکن چونکہ یہ خوش قسمتی سے ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس مہلک لغزش سے بچ گئے اور اب میں انھیں نہایت استحکام کے ساتھ بلند چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

لکھنؤ میں جب کبھی مجھے ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا، میں نے ان کے ذوق کی پاکیزگی کو بین طور پر محسوس کیا، لیکن یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی کہ وہ مستقبل میں اس کو فن کی حیثیت سے اختیار کریں گے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے فراق کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں ہے اور ایسا شخص جو ہر رنگ میں کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقتاً کسی کا شاگرد ہو بھی نہیں سکتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اگر ہم اسوقت یہ معلوم

کرنا چاہیں کہ فراق کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے۔

ان کا میلان وہی ہے جو مصحفی کا تھا کہ جس رنگ کو لیا اپنا بنا لیا اور ذہین و بیقرار طبیعت رکھنے والے شاعروں کو اکثر و بیشتر اسی نیرنگی میں مبتلا پایا گیا ہے علی الخصوص اس وقت جب فطرت کے ساتھ ساتھ ان کا اکتساب بھی کام کرنے لگتا ہے۔ تاہم بلحاظ انداز بیان اگر ان کو "مومن اسکول" میں شامل کیا جائے تو شاید زیادہ موزوں ہوگا۔

میں پہلے ظاہر کرچکا ہوں کہ شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر اسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔ اس کو دو آتشہ، سہ آتشہ جو کچھ کہئے کم ہے۔ پھر چونکہ فراق کے کلام میں ان تینوں کا اجتماع ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے "قدر اول" کا مرتبہ نہ دیا جائے۔

یہ بالکل درست ہے کہ فراق کے کلام میں اسقام بھی پائے جاتے ہیں، یعنی نہ وہ فنی غلطیوں سے یکسر پاک ہے اور نہ بیان کی ژولیدگیوں سے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاعرانہ روح اُن کے ہر ہر شعر سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ مخصوص والہانہ انداز جو غزل کی جان ہے کسی جگہ ہاتھ سے چھٹنے نہیں پاتا۔ فراق اب شاید مشاعروں کی طرحوں پر بھی غزلیں لکھتے ہیں اور "فرمایشی شعر گوئی" کے لئے بھی طیار ہوجاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ مشق سخن کے لئے یہ طریق کار مفید ہو، لیکن شاید "پاکیزگی سخن" کا اقتضاء کچھ اور ہے چنانچہ جس وقت ہم فراق کی طرحی و غیر طرحی غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو دونوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مغنی کی وہ حیثیت جب وہ تنہائی میں بیٹھ کر صرف اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے گنگناتا ہے، اُس حیثیت سے بہت مختلف ہوتی ہے جب اس کا مقصود صرف دوسروں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ظاہر کیا کہ فراق کی شاعری میں مومن کا رنگ غالب ہے، لیکن قبل اس کے کہ میں فراق کا کلام پیش کرکے اس کی وضاحت کروں، خصوصیات مومن کا مختصراً ظاہر کردینا ضروری ہے۔

مومن کی تنہا وہ خصوصیت جس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں، اس کے اندازِ بیان کی بلاغت ہے، جس طرح ایک مصور کے حسن ذوق کا پتہ چلانے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے کس زاویہ سے تصویر لی ہے۔ اسی طرح ایک شاعر کے حُسن بیان پر حکم لگانے کے لئے ہم کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس خیال کا "خطِ رفتار" کیا ہے اور اس نے اپنا تیر کس گوشہ سے چلایا ہے۔ اور اسی کی جدت و ندرت پر کلام کی خوبی کا انحصار ہے، جو مومن کا حصہ کہلاتی ہے۔ اندازِ بیان کی ندرت غالب کے یہاں بھی ہے اور کبھی کبھی یہ دونوں ایک دوسرے سے اسقدر مل جاتے ہیں کہ امتیاز دشوار ہوجاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مومن

جو کچھ کہتا ہے وہ بہت ڈوب کر کہتا ہے اور غالب کی حیثیت صرف "گاہ گاہ غوطہ زنی" کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ دوسری خصوصیت مومن کی اس کی فارسی ترکیبوں کی حلاوت ہے اور تیسری یہ کہ اسکی شاعری اسی دنیا کی ہے، اسی دنیا کے انسانوں کی ہے اور اسی "عالم آب و گل" کے جذبات و احساسات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فراق کی شاعری میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی انداز بیان میں بھی ندرت ہے اور فارسی ترکیبیں بھی وہ بہت شگفتہ استعمال کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ کار زمیں سے ہٹ کر وہ آسمان پروازی میں مبتلا نہیں ہوتے، ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

مضمون نیا نہیں ہے لیکن سلاست الفاظ اور سادگی بیان کے ساتھ محبت کی اس خاص کیفیت کو (جس سے ہر شخص واقف ہے لیکن ادا نہیں کر سکتا) ایسے سہل ممتنع انداز میں ظاہر کر دینا، یہ ہے اس شعر کی جان جس سے سننے والا فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔

اسی زمین کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

دوسرے مصرعہ کے بیساختہ پن اور ردیف و قافیہ کی خوبصورت صرف نے شعر کے مفہوم کو حد درجہ دلنشیں بنا دیا ہے۔ محبوب کے یاد آنے اور نہ آنے کے متعلق حسرت موہانی کا مشہور شعر ہے:۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اور حقیقت یہ ہے کہ اس پر ترقی بہت دشوار تھی، لیکن فراق نے زاویۂ بیان بدل کر اس میں اک نئی کیفیت پیدا کر دی۔

اسی غزل کا ایک شعر خالص مومن کے رنگ کا دیکھئے:۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ، اب مجھ سے تجھے رنجش بیجا بھی نہیں

مہربانی اور محبت کے نازک فرق کو "رنجش بیجا" کے ذکر کے بعد اس انداز سے بیان کرنا شاعری کا کمال ہے اور فراق کا صرف یہ ایک شعر ان کے پاکیزگی ذوق کی اتنی زبردست شہادت ہے کہ اس کے بعد کسی اور استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ فطرت انسانی اور اسکے مختلف مظاہر کا وسیع مطالعہ کیا جائے۔ تعبیرات میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے فراق کی کامیابیاں اس باب میں ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں:۔

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

بیانِ زندگی کے سلسلہ میں دیوانے کی اچٹی ہوئی نیند کی طرف ذہن کا منتقل ہونا اور پھر اسکی توضیح کرتے ہوئے یہ کہہ جانا کہ " نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی" انتہائے بلاغت ہے۔

چند اور تعبیرات ملاحظہ ہوں:۔

قید کیا رہائی کیا، ہے ہمیں میں ہر عالم ۔۔۔ چل پڑے تو صحرا ہے، رک گئے تو زنداں ہے

اللہ رے اضطراب کہ جس اضطراب کا ۔۔۔ موجِ فنا بھی اک اثرِ ناتمام ہو

اس بحرِ محبت میں اے دل ڈوبنے والے بچتے ہیں ۔۔۔ پانی کو گزرنے دے سر سے پھر دیکھ کہ بیڑا پار بھی ہے

اپنے چل پڑنے کو صحرا اور ٹھہر جانے کو زنداں قرار دینا۔ اسی طرح فنا کو " اضطراب ناتمام " سے تعبیر کرنا اور سر سے پانی گزر جانے کو بیڑا پار ہو جانا کہنا، معمولی متخیلہ کا کام نہیں۔ ایک اور لطیف شعر اسی رنگ کا دیکھئے

خواب گاہ میں تیری ہم ہیں نیند کے جھونکے ۔۔۔ اک سکونِ بے پایاں ہستی پریشاں ہے

فراق کی ایک بالکل نئی تخئیل ملاحظہ ہو:۔

کہاں کا وصل، تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے ۔۔۔ ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

محبوب کے دم بھر آجانے کی یہ تعبیر کہ شاید تنہائی نے بھیس بدلا ہے، ہندی شاعری کی چیز ہے اور اُردو شاعری میں میری نگاہ سے کہیں نہیں گزری خالص وارداتِ محبت اور کیفیاتِ حسن و عشق کے بھی چند اشعار سن لیجئے:۔

غرضکہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست ۔۔۔ وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

نثار پرسشِ غم کے میں کیا کہوں آخر ۔۔۔ کہ تجھ سے اب وہ مری سرگرانیاں نہ رہیں

تو نہ چاہے تو تجھے پاکے بھی ناکام رہیں ۔۔۔ تو جو چاہے تو غم ہجر بھی آساں ہو جائے

پردۂ یاس میں امید نے کروٹ بدلی ۔۔۔ شبِ غم تجھ میں کمی تھی اسی افسانے کی

پہلا شعر میر کے رنگ کا ہے اور ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو عشقِ بلند کلام کے سوز و گداز میں پائی جاتی ہیں۔

دوسرے شعر میں صرف "پرسشِ غم" کو سرگرانیوں کے دور ہو جانے کا باعث قرار دینا اُن تاثرات سے متعلق ہے جو "کاروبارِ محبت" میں غریب عاشق کو ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔

تیسرے شعر میں فلسفۂ ہجر و وصال پر بالکل نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور چوتھا شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ غم کے بقا کا تعلق حقیقتاً امید سے ہے نہ کہ یاس سے۔ کیونکہ یاس کی انتہا سکون ہے اور غم کے منافی۔ اندازِ بیان نے اس خیال کو بہت زیادہ لطیف صورت دیکر پیش کیا ہے۔

محبت کی بیقراری بڑی پُرلطف چیز ہوتی ہے اور عاشق ہمیشہ اس کے قیام کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن اسی کے ساتھ کبھی کبھی گھبرا کر وہ ضبط و غم کے متاع کی طرف بھی ہاتھ بڑھا دیتا ہے، جس کا ردِ عمل اور زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ اس خیال کو فراقؔ نے جس خوبصورتی سے ادا کیا ہے وہ شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

فریبِ صبر کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے نہ آیا بیقراری کو حیات جاوداں ہونا

اسی غزل میں ایک نہایت نازک تخیل ملاحظہ کیجیے:۔

ہر آوازِ جرس پر اک صدائے بازگشت آئی بہت ہے اسقدر بھی، خیر، یادِ رفتگاں ہونا

آوازِ جرس کی صدائے بازگشت کو "یادِ رفتگاں" کہنا بڑا اسپاوری (ETHERIAL) تخیل ہے۔

ایک اور شعر اسی زمین کا یہ ہے:۔

ابھی اک "پرتوِ حسنِ خیالِ یار باقی ہے" ابھی آیا نہیں فرقت کو دردِ رائیگاں ہونا

پہلا مصرعہ فراقؔ کا نہیں ہے، بلکہ یہ ادنیٰ تغیر غالبؔ کا ہے، لیکن فراقؔ نے دوسرا مصرعہ لگا کر اسے بالکل اپنا بنا لیا۔ اور غالبؔ سے زیادہ حُسن کے ساتھ۔ فرقت کو صرف اس لئے "دردِ رائیگاں" نہ کہہ سکنا کہ پرتوِ حُسنِ خیالِ یار ہنوز باقی ہے، نہایت لطیف بات ہے۔

شعرا نے "حُسنِ مجرد" کے خیال کو مختلف پیرایوں سے ظاہر کیا ہے، لیکن فراقؔ کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو:۔

بہارِ چند روزہ کو بہارِ جاوداں کر دے قیودِ رنگ و بو سے کچھ الگ کر دے گلستاں کو

تکرارِ الفاظ سے معنی میں حُسن پیدا کرنا بہت کافی مشق چاہتا ہے، فراقؔ کے کلام میں بعض نمونے اس رنگ کے نہایت پاکیزہ پائے جاتے ہیں:۔

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

بے خبری ظاہر کرنے کی یہ تعبیر کرنا کہ گویا "اہلِ کارواں" کارواں میں شامل ہی نہ تھے بڑا لطیف

انداز بیان ہے۔ اسی غزل کا مقطع ہے:-

پھر بھی سکونِ عشق پہ آنکھ بھر آئی بار ہا — گو غم ہجر بھی فراق کچھ غم جاوداں نہ تھا

دوسرے مصرعہ میں فراق کا (ق) تقطیع سے گرتا ہے، لیکن شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔
فراق نے بعض غزلیں ایسی لکھی ہیں، جو شروع سے اخیر تک مرصع ہیں مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو:-

یہ پچھلے کل کوئی بے اختیار روتا تھا — وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا
کسی کے ہاتھ نہ آیا سوائے غفلتِ ہوش — ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا
کچھ ایسی بات نہ تھی تجھ سے دور ہو جانا — یہ بات الگ ہے کہ رہ رہ کے درد ہوتا تھا
نہ پوچھ سود و زیاں کاروبار الفت کے — دگرنہ یوں تو نہ کھونا تھا کچھ نہ پانا تھا
اگر نہیں وہ ترے حسنِ بے نیاز کی آہ — میں تیری بزم سے جب ناامید اٹھتا تھا
ہر ایک سانس ہے تجدید "یاد آیا ہے" — گزر گیا وہ زمانہ جسے گزرنا تھا
کہاں یہ چوک ہوئی تیرے بیقراروں سے — زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید — مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رنجوریِ محبت کے بیان میں جس کیفیت و سادگی، جس سلاست حلاوت کی ضرورت ہے وہ کسقدر تکمیل کے ساتھ ان شعروں میں پائی جاتی ہے۔

اب اور چند متفرق اشعار سن لیجئے:-

اب اور اسے وہم و گماں ہے سکوتِ ناز — وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے
گزر رہا ہو کہ شہر خموشاں سے آج کون — سو مرتبہ چراغِ لحد جھلملا چکے

دل چاہتا ہے وعدۂ جاناں کو استوار — اے وائے عشق میں بھی اگر انتظام ہو

گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں — بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

کھلے رازِ دل تو یہ دیکھنا کہ دہن سے شعلے بھڑک اٹھے — یہ نہ پوچھ پھوٹے ہوں گے کیا جو فراق چھالے زباں کے ہیں

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے — ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دعا سے پہلے

اے فراق انھیں پاکے ہم یہ ڈھیں کہتے ہیں سوچئے تو مشکل ہے دیکھئے تو آساں ہے

جلوہ حسن نثار غم پنہاں کردے عشق توفیق جو دے وصل کو ہجراں کردے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا یہ فرق مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے
یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بدنصیب تم دل دکھاؤ وقت مصیبت تو بات ہے

ہاں بتا دے مجھے وہ رابطۂ ترک طلب جس سے آجائے مجھے تیری تمنا کرنا

یہ ایسے اشعار ہیں کہ اگر کسی خوش ذوق انسان کے سامنے پڑھ دئے جائیں اور اس کو یہ نہ بتایا جائے کہ ان کا کہنے والا کون ہے تو وہ انھیں دہلی کے دور متاخرین کے کسی شاعر کا کلام سمجھے گا، جبکہ غزلگوئی صرف جذبات و تاثرات کے اظہار کا نام تھی، ہر چند موجودہ دور بھی بڑی حد تک اسی اصول کا پابند ہے لیکن انداز بیان اس کا کچھ اور ہے۔ پہلے معنی آفرینی کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہ کی جاتی تھی اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ "احساسات محبت" صنعت سے بیگانہ تھے۔ اب لوگوں میں "احساس محبت" بجائے "وقوف احساس" زیادہ ہے، اس لئے اس کی باریکیاں تو زیادہ کامیابی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں لیکن "کیفیت" پیدا کرنے میں اسقدر کامیاب نہیں ہوتے۔

فراق کی شاعری میں "احساس" و "وقوف احساس" دونوں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ کیفیت و حلاوت کی بھی کمی نہیں اور وہ فنا دگی و والہانہ ادا بھی ہر جگہ موجود ہے جو محبت کا لازمی نتیجہ اور تغزل کی جان ہے۔

فراق نے اپنے ایک خط میں خود اپنی غزلگوئی کے متعلق عجیب و غریب تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں:-

"جس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں، اسی طرح غزل سے ہوتا کیا ہے، مگر مجبوریاں اور مایوسیاں جھک مارنے پر آمادہ کر ہی دیتی ہیں"

سو آپ فراق کا سارا کلام پڑھ جائیے، یہ محبت کی "مجبوری و مایوسی" بقدر مشترک اسکے ہر شعر میں نظر آئے گی اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی غزلگوئی کو دوسرے نوجوان شعراء کے تغزل سے ممتاز کر دیا ہے۔

فراق کے کلام میں جا بجا ندرت بیان اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ وہ کچھ اچھی بدلی سی چیز نظر

آتی ہے۔ اس کا سبب مغربی لٹریچر کی وسعت مطالعہ ہے، جس سے فراق کا متخیلہ متاثر ہو کر بغیر کسی قصد و ارادہ کے بعض بعض جگہ انداز بیان کی بالکل نئی راہیں اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اجنبیت کسی جگہ پیدا ہونے نہیں پاتی اور سوائے اس کے کہ ذہن انسانی مطالعہ عمیق کی طرف مجبور ہو کوئی ناگوار اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔

الغرض فراق کی غزلگوئی کا مستقبل مجھے بہت درخشاں نظر آتا ہے اور اگر انھوں نے اپنے اس فطری ذوق کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی توجہ فن کی طرف بھی صرف کر دی تو اس دور کے باکمال شعراء کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کر لینا بالکل یقینی ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ان کی ایک بالکل تازہ غزل موصول ہوئی جسے میں اپنے انتقاد پر مہر توثیق کی صورت سے یہاں درج کئے دیتا ہوں:۔

نیرنگ حسنِ یار اترے بس میں کیا نہیں — لطف و کرم تو مانعِ جور و جفا نہیں — آہ

جن کی صدائے درد سے نیندیں حرام تھیں — نالے اب انکے بند ہیں۔ تو نے سنا نہیں؟

کس درجہ پردہ دار، طلسم نگاہ ہے — اس بزم میں کسی کو کسی کا پتا نہیں

میرے سکوتِ یاس پر اتنا نہ ہو ملول — مجھ کو خدانخواستہ تجھ سے گلا نہیں

نیرنگیِ امید کرم ان سے پوچھئے — جن کو جفائے یار کا بھی آسرا نہیں

تھا حاصل پیام ترا اے نگاہ ناز — وہ رازِ عاشقی جسے تو نے کہا نہیں

اللہ دردِ عشق کی غیرت کو کیا ہوا — اتنا بھی بے نیاز وہ جانِ وفا نہیں

میں شادکام دید بھی محروم دید بھی — ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں

ہر گردشِ نگاہ ہے دورِ حیات نو — دنیا کو جو بدل نہ دے وہ میکدہ نہیں

اس رہگذار پر ہے رواں کاروانِ عشق — کوسوں جہاں کسی کو خود اپنا پتا نہیں

بس اک پیامِ نرگس مستانہ ہے فراقؔ
مجھ کو دماغ کاوش لطف و جفا نہیں

اگر آپ روحانیات سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو "جن" کے پرچے مطالعہ کیجئے
فی پرچہ اصل قیمت ۴ر۔ رعایتی ۲ر علاوہ محصول۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

مکتوبات نیاز

صدیقی ۔ نامۂ خلوص کا شکریہ ۔ آپ نے اپنی "کاوشِ ذہن آزما" کی صراحت نہیں کی، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ ایسے ذہین نوجوانوں کے دلوں میں کیا ہیجان و تلاطم برپا رہتا ہے

"گزر چکے ہیں یہ لیل و نہار ہم پر بھی"

دیکھئے آپ صحیح و تندرست ہو چکے ہیں اور اب اپنی بیماری کا ذکر اس طرح نہ کیجئے گویا آپ کسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں ۔ زندگی نام صرف جوانی کا ہے اور شاید ہوسرانی کا بھی، پھر وہ جتنی زیادہ گریز پا ثابت ہو اتنی ہی زیادہ عزیز ہونی چاہئے ۔ خیام کا فلسفہ مجھے اتنا زیادہ پسند نہیں جتنا اس کا عمل (اگر واقعی اس نے کبھی بادہ خواری کی تھی) اس لئے

دراں مقام کہ ساقی قدح بگرداند

چرا سخن رود از خضر و آب حیوانش

جب تک تعلق کاروبار فطرت سے رہے ہیں شاعری کا زیادہ قایل نہیں لیکن ایک ذرا باغیانہ روح اپنے اندر پیدا کر لیجئے پھر دیکھئے کہ "راز زیست سوائے شاعری کے اور کیا رہجاتا ہے ۔ اس سے میری مراد وہ "استغناءِ نفس" ہے جو "دیہیم شاہانہ" کے ساتھ ساتھ عرفی کی زبان سے "گدا کلاہ نمد کج نہاد" کہلوائے بغیر نہ رہسکا ۔ بیدل اس چیز کو یوں ظاہر کرتا ہے :۔

خونے بجگر جمع کن و رنگ بروں آ

اس کا رنگ زیادہ گہرا ہے اور اسی لئے اس میں ہلکا سا تشاؤم (PESSIMISM) پیدا ہو گیا ہے۔ آپ غالب کی زبان میں اسے یوں سمجھئے

صد رنگ گل بہ جلوہ بر آید ز نوکِ خار

جلال اسیر اس سے بھی بڑھ گیا ۔ کہتا ہے ۔

میزنم بر سر گلے تا خارے از پا می کشم

بہر حال مدعا یہ کہنا ہے کہ اب آپ ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیجئے جن سے دوسروں کا دل دُکھے (خود آپ کو اگر کوئی لطف اس میں آتا ہے تو آیا کرے) آپ اگر خود کسی سے محبت کرنا پسند نہیں کرتے تو دوسروں کی محبت کا امتحان آپ کیوں اس طرح لیتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ محبت کئے جانے کی لذت سے آپ بےخبر نہیں ہیں اور اسی لئے یہ لنترانیاں ہیں — نوعمری میں ایسی پختہ کارانہ باتیں کرنا بھی میرے نزدیک لنترانی ہی کی ایک قسم ہے۔

آپ کی نظم کا ایک ایک شعر مستقل صحیفہ ہے —— مئی کے نگار میں شایع ہوگی۔ نینی تال آنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں، لیکن مطمئن رہئے میں لکھنؤ کی گرمیوں میں بھی آپ کو نہ بھولوں گا۔

مکرمی — مضمون پہونچا۔ شکریہ۔ واقعی آپ نے بہت کاوش کی ہے لیکن میں اس "جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہی" کا قایل نہیں — یعنی

یا تو بیگانے ہی رہئے ہو جئے یا آشنا

اور آشنا رہنے کی صورت یہ ہے کہ میرے مستقل حلیف ہو جایئے۔ فرمایئے کیا ارادہ ہے جاپان والا مضمون تو کہیں گم ہو گیا۔ فتوائے کفر والے پرچے اب نہیں ملسکتے ختم ہو گئے۔ جاہستان میں دو ایک مضمون شامل ہیں۔ ایک جلد مکتوبات کی روانہ کی جاتی ہے۔

گرامی نامہ کا شکریہ — اچھا ہوا آپ راولپنڈی آ گئے۔ ابھی سے یہ خیال دل میں گدگدی پیدا کر رہا ہے کہ

من و کوہِ مریؔ و انجمتانے

عدم صاحب ملیں تو جتنی شکایتیں بے توجہی کی ممکن ہیں وہ سب میری طرف سے کر دیجئے۔ دیکھئے جب کسی کا گریبان دسترس سے دور ہوتا ہے تو بےکسی کا یہ عالم ہو جاتا ہے۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر ملسکتے ہیں جو اُن کے آگے درج ہے:- (سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر — سنہ ۲۳ء) مئی ۴ر — (سنہ ۲۴ء) جنوری۔ فروری و اگست ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ (سنہ ۲۸ء) اپریل۔ مئی و جون ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۱ء) جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۲ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر — فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ (سنہ ۳۴ء) فروری جولائی و اکتوبر ۴ر فی پرچہ ۴ر (سنہ ۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) عا ر —

منیجر نگار۔ لکھنؤ

تخلیقِ غم

جب مکمل عرش پر دُنیا کا خاکہ ہو چکا
جب مرتب بزمِ فطرت کا صحیفا ہو چکا
خاک کے ذروں میں پیدا ہو چکی تابندگی
جب چمن کا پھول رنگ و بو کا تارا ہو چکا
اُٹھ چکے جب راز کے پردے حریمِ ناز سے
بارگاہِ عشق میں جب حُسن رسوا ہو چکا
چاندنی سے جب برسنے لگ گئیں سرمستیاں
یعنی جب بہتا ہوا پانی بھی بادہ ہو چکا
لیکر انگڑائی جب اُٹھ بیٹھی عروسِ بیخودی
جب محبت کے نشیمن میں اُجالا ہو چکا
جب فرشتے زندگی کے گیت گانے لگ گئے
جب جنوں ویرانیوں میں جلوہ فرما ہو چکا

کارفرمائے حقیقت کی نگاہِ تبصرہ
لینے آئی اپنی دنیا کا مکمل جایزہ

تھی مگر دنیا کے چہرے پر ابھی بے رونقی
مسکراتے پھول کے دل میں بھی تھی افسردگی
ماہ و انجم کی ضیا پر ایک مضحک تبصرہ،
یاسمن کی بزم میں تھی جگنوؤں کی روشنی
بند لب غنچے ابھی وابستۂ اسرار تھے
بیہشی کا رنگ لے لیتی تھی اکثر بیخودی
عشق کی بدمست راتوں میں تھی کچھ بے کیفیاں
حسن کی رنگیں سحر پر کچھ گراں تھی زندگی
چاند کی خاموش کرنوں میں تھا اک مہمل سکوت
رات کی رومان نوازی میں نہ تھی کچھ دلکشی
بادہ سامانیِ نرگس میں تھی بے معنی نشاط
سر دُھنوں سے بھری تھی زندگی کی بانسری

مختصر یہ ہے کہ یہ عالم ابھی عالم نہ تھا
یعنی اس ہنگامۂ عشرت میں جزوِ غم نہ تھا

غم ہوا پیدا سورج کی کرن کے ساتھ ساتھ
نالہ جاگا نغمہ ہائے انجمن کے ساتھ ساتھ
خشکیاں سوکھی زباں کی طرح بل کھانے لگیں
تتلیوں کے سائے میں جوئے چمن کے ساتھ ساتھ
زندگی نے جا کے ویرانوں میں بھی اک سانس لی
غربت ایجادی ہوئی عیشِ وطن کے ساتھ ساتھ
اشک میں پیدا ہوا چنگاریوں کا سوز و ساز
داغ کا رشتہ ہوا ہر پیرہن کے ساتھ ساتھ
درد اک نادیدہ نشتر بن کے لہراتا ہوا
چبھ گیا دل میں خمارِ انجمن کے ساتھ ساتھ

فکر نے اک آہنی پنجے میں جکڑا ذہن کو
یاس ابھر آئی جبیں کی ہر شکن کے ساتھ ساتھ

کشمکش جب داخل آدابِ ہستی ہوگئی
کام کی دنیا یہ انسانوں کی بستی ہوگئی

غم نے چاہا آئنہ دل کا چمکتا ہی رہے
غم نہ ہو تو بزمِ ہستی میں اندھیرا ہی رہے

غم نے چھینے ہیں مقدر سے ہلاکت کے چلن
غم نہ ہو تو مادّتو کی جنگ برپا ہی رہے

غم نے بھڑکا کر بجھایا سخت کوشی کا چراغ
غم نہ ہو تو دل مثالِ شمع جلتا ہی رہے

غم نے بزمِ قدس میں دل کو دیا اذنِ سکوں
غم نہ ہو تو آسماں نظروں کا پردا ہی رہے

غم نے کی دنیا میں تکمیلِ مذاقِ بیخودی
غم نہ ہو تو عاشقی وقفِ تمنا ہی رہے

غم نے قایم کر دیا ربطِ جبینِ آستاں
غم نہ ہو تو حسن کا ہر رنگ رسوا ہی رہے

غم خوشی کے نور میں لپٹا ہوا اک تیر ہے
غم کتابِ آدمیت کی نئی تفسیر ہے

فضل الدین اثر اکبرآبادی

غزل

عشق نے روح کو جب، درد سے آباد کیا
ذوقِ گفتار کو آمادۂ فریاد کیا

عشق اور عقل کا مخلوط کرشمہ ہے بشر
خوب تعمیر یہ مجموعۂ اضداد کیا

اب میری حالتِ غمناک یہ کڑھنا کیسا
کیا ہوا مجھ کو اگر آپ نے برباد کیا

حادثہ ہے، مگر ایسا تو المناک نہیں!
یعنی اک دوست نے اک دوست کو برباد کیا

یاد کرنے سے کیا گو کہ بہت ہی پرہیز
پھر بھی دیوانوں کی مانند اُسے یاد کیا

ہم نہ پیتے کبھی اے ساقیِ بے فیض مگر
تیری مخمور نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا

بات جو تم نے کہی سوز سے لبریز کہی
واہ کیا تذکرۂ دردِ خداداد کیا

بربطِ غالب و مومن کی صدا آتی ہے
از سرِ نو وہ فسوں کس نے پھر ایجاد کیا

عدم

اعترافِ شکست

بےخبر تھا نیند کی آغوش میں سارا جہاں — ڈھل رہی تھی رات نغموں کی زباں میں لوریاں
جو گیا کی مست دُھن میں گا رہی تھی خامشی — نیند اپنے راگ سے برسا رہی تھی خامشی
چاند کا سیماب گوں دریا ترنم ریز تھا — کاروانِ انجمِ سیمیں تبسم ریز تھا
چاندنی اور چاند تار دل پر یہ ہوتا تھا گماں — بحرِ سیمیں کشتیِ زر گنگا جمنی مچھلیاں
وادیوں میں شوخیاں دکھلا رہی تھی چاندنی — پہلوئے کہسار میں شرما رہی تھی چاندنی
یہ تو سب کچھ تھا سو تھا طرفہ ستم یہ بھی ہوا — پاس کے اک پیڑ پر ظالم پپیہا بول اُٹھا
ہو کے برہم رہ گیا عقل و خرد کا بندوبست — وہ مثلِ صادق ہوئی دیوانہ ہو کے لبوں سے
آشنا سی کوئی شے سینے کو برمانے لگی — دل سے اٹھ اٹھ کر لبوں تک آنچ سی آنے لگی
دل کی دنیا ایک بیک لینے لگی انگڑائیاں — آنکھ کے پردوں پہ کچھ پھرنے لگیں پرچھائیاں
ہلکی ہلکی چٹکیاں دل میں کوئی لینے لگا — گرتے پڑتے کشتیِ امید پھر بہنے لگی
بیخودی و بیہشی کی موج لہرانے لگی — ہوش و ادراک و خرد کو نیند سی آنے لگی
پڑ گئی اک جان سی دل کے شکستہ ساز میں — منتقل ہونے لگی ہر سانس اک آواز میں
رفتہ رفتہ سانس کی آوازیں آہیں بن گئیں — اک مرقع عہدِ ماضی کا نگاہوں میں پھر گیا
آنکھ میں آ کر دھواں آہوں کا پانی بن گیا — اور یہ پانی نویدِ زندگانی بن گیا
کشتگانِ جبر سارے مرتے مرتے جی اُٹھے — یعنی سب ارمانِ دل ایک ایک کر کے جی اُٹھے
دل میں ہوک اُٹھی لبوں پر شورِ فریاد آ گیا — بھولنے کی جس کی کوشش تھی وہی یاد آ گیا
اے مرے یاد آنے والے اے مرے دل کے مکیں — لے ربابِ زندگی کے نغمۂ گیتِ آخریں
سعیِ ترکِ عشق بھی ہے اک نہفتہ رازِ عشق — انتہائے بیخودی اور ابتدائے نازِ عشق
جانِ جسمِ زار سے بیزار ہے تیرے بغیر — آ، کہ میری زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
تو بھلانے والی شے ہے بھولنے کی شے نہیں — مے نہ ہو گر دشمنِ تمکیں تو وہ مے ہی نہیں
مان جا پیماں شکن ظالم خدارا مان جا — مان جا، واللہ تو جیتا میں ہارا مان جا

دعوت

بیاکہ لیلیٰ فطرت سے ہے محوِ نازہنوز
نشاطِ روح ہے رعنائی مجاز ہنوز

یہ سبزہ زار یہ چشمے یہ آسماں یہ زمیں
مری نظر میں ہیں اک عکس جلوۂ رنگیں
کہ دیدہ ہائے دل رازداں ہیں باز ہنوز

شفق کے رنگِ خیالی پہ جان دیتا ہوں
میں حُسنِ ماہ کو نذر اک جہان دیتا ہوں
رہینِ سجدہ ہے میرا سرِ نیاز ہنوز

فضول ہے مرے مسلک میں گفتگوئے دیں
کہ سُن رہا ہوں پرندوں کا نغمۂ شیریں
نصیبِ گوش ہے صد لذّتِ نماز ہنوز

ابھی ہے روح میں اک کیف کا اثر باقی
نیازِ عشق کی بخشی ہوئی نظر باقی،
زبانِ دل پہ نہیں داغِ حرص دآز ہنوز

ابھی ہے نشترِ یادِ حبیب وجہ تپش
درونِ روح فراوانی متاعِ خلش
ہے صرفِ آدِ جنوں زاشبِ دراز ہنوز

ابھی ہے دفترِ کفر و ہدایہ سب بے معنی
ابھی ہے گفتگوئے زہدِ خشک لایعنی
ہر اک نفس ہے مرادِ قفِ سوز و ساز ہنوز

جنونِ قلب میں جامہ دری کی ہی قوت
پتنگِ عقل اُڑانے کی ہے ابھی ہمّت
نثار تجھ پہ ہے رعنائی مجاز ہنوز

ازل سے غزنویِ صرفِ اضطراب ہوں میں
تلاشِ حُسن میں ڈوبا ہوا شباب ہوں میں
مری نگاہ میں ہے صورتِ ایاز ہنوز

ہوئی جو چشمِ کرم میرے حال کے شامل
رہا نہ دیر و حرم کی گرفت کے قابل
ہے وقفِ دید مری چشمِ امتیاز ہنوز

خدا کرے کہ یہ ہدیہ قبول ہو جائے
سرورِ طائرِ دل کو حصول ہو جائے
ہے رہنِ گرسنگی حرص شاہباز ہنوز

مضطر شاہجہانپوری ایم - اے

وادیِ ایمن میں

تعالی اللہ یہ صحرا یہ وادی اور یہ منظر
جدھر جاتی ہیں نظریں، بجلیاں سی کوند جاتی ہیں
کھڑی ہے یادگارِ اشتیاقِ حضرتِ موسیٰ
جو اُن کے جلوۂ صد رنگ پر قربان جاتی ہیں
جہاں اُنکے جمالِ حُسن کا پرتو جھلکتا ہے
جو بعد موت بھی زندہ رہے جینا اُسی کا ہے
یہ ایمن، اور یہ وادیِ سینا کیا تماشا ہے
وہ کوہِ طور جس پر بجلیاں جلووں کی کوندی تھیں
مذاقِ ابن عمراں اب کہاں ملتا ہے انساں کو
پہاڑ اب بھی تمنائی ہیں جلوہ گاہ بننے کے
درختوں سے ٹپکنے کو بہت مضطر ہیں انگارے
تجلی آشنا، اللہ کا پیارا نہیں کوئی
الٰہی میری آنکھوں کو مذاقِ چشمِ موسیٰ دے
گرا دے بجلیاں مجھ پر حیات افروز جلووں کی
وہ گرمیِ محبت آج پھر کر دے عطا مجھ کو
اگر بجلی نہیں ہے میرے ظرفِ تنگ کے قابل
کلیم اللہ کا منصب اگر اب مل نہیں سکتا،
مسیحا ہو نہیں سکتا کہ موسیٰ ہو نہیں سکتا
اب اس دشتِ مقدس سے میں خالی ہاتھ کیا جاؤں
یہاں تو بجلیاں بھی بھیک میں انساں کو ملتی ہیں
پلا دے وہ مئے دو آتشہ میخانے سے اپنے
جلا دے میرے سامانِ خودی کو پھونک دے مجھکو
ملا دے خاک کر کے خاک میں وادیِ ایمن کو
مجھے آنکھوں میں اپنی اہلِ عالم عمر بھر رکھیں

ہزاروں آئینہ خانے جڑے ہیں ایک ذرّے پر
یہیں تو برقِ جلوہ نے کیا تھا طور خاکستر
نیاز و ناز کے افسانے کہتا ہے ہر اک کنکر
حیاتِ جاوداں ملتی ہے اُنکو دہر میں اکثر
وہاں نورِ نظر بنتا ہے ہر چھوٹا بڑا پتھر
سہے جو چوٹ برقِ حسن کی سینہ اُسی کا ہے
یہاں تو ذرّے ذرّے کو انا الموسیٰ کا دعویٰ ہے
پھر اُس کو آتشِ جلوہ سے جل جانے کا سودا ہے
اب اس وادی میں جلووں کا بھکاری کون آتا ہے
مگر حُسنِ ازل کو انتظارِ چشمِ موسیٰ ہے
فضا کو اضطرابِ مقدمِ مہمانِ سینا ہے
وہی ہے انجمن، اور انجمن آرا نہیں کوئی
برہنہ پا مجھے اُس طور کی چوٹی پہ پہنچا دے
مرے ذوقِ تپش کو دعوتِ وادیِ سینا دے
جو ہر رگ میں دلِ مضطر کی اک شعلہ سا بھڑکا دے
سوادِ طور پر اک مشعلِ جلوہ ہی چمکا دے
تو شمعِ طور کا پروانہ بنجانے کا سودا دے
جو تو چاہے تو دیوانہ ترا کیا ہو نہیں سکتا
یدِ بیضا عنایت کر کہ چمکاتا ہوا جاؤں
یہاں آکر میں کیوں محرومِ انوار و ضیا جاؤں
کہ جس کے نشے سے بزمِ جناں تک جھومتا جاؤں
تمنا ہے کہ اب جاؤں تو بے برگ و نوا جاؤں
شعاعِ نور بنکر تیرے جلووں میں سما جاؤں
مری مٹی بھی سُرمہ کی طرح اہلِ نظر رکھیں

(نبی احمد بریلوی)

آیندہ جنوری ۱۹۳۸ء کا "نگار"

دو چند ضخامت کے ساتھ صرف ایک موضوع پر شایع ہوگا
اور موضوع بھی وہ جو نہایت اہم ہے — یعنی — اسلامی ہند کی تاریخ

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تاریخ تین یا چار قسطوں میں مکمل ہو جائیگی اور اسکی پہلی قسط جنوری ۱۹۳۸ء کے نگار میں شایع ہوگی
اسلامی ہند کی تاریخ بالکل جدید اصول پر نہایت کاوش و تحقیق سے لکھی گئی ہے
اس میں تمام تاریخی ماخذوں کی حقیقت سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان مقامات کی جغرافی
تحقیق بھی اس میں پائی جاتی ہے جن کا نام تو تاریخوں میں نظر آتا ہے لیکن انکی تعیین بہت کم ہوگئی ہے

"اڈیٹر نگار کا بے مثل تاریخی کارنامہ"

اگر دیکھنا ہو تو جنوری ۱۹۳۸ء کا "نگار" ضرور حاصل کیجئے اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اسکے
خریدار پیدا کیجئے۔ قیمت فی کاپی دو روپیہ — نگار کے سالانہ خریداروں کو اسی سالانہ چندہ
میں ملے گا۔ ششماہی خریدار اس رعایت سے فایدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

منیجر نگار

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دُنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سعہ) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲/)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲/) کم

فراست الید

مؤلفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری۔ شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عار)

علاوہ محصول